محرم ۱۳۵۷ھ
جلد ۱۲ — عدد ۱

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے
قیمت فی پرچہ ۸ آنے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

مینیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـہ ۱۰	عـہ ۲۵	للعـہ ۴۵	لـہ
نصف صفحہ	۶ ـے	عـہ ۱۵	عـہ ۲۵	للعـہ ۴۵
ربع صفحہ	للعہ ۴	عـہ ۱۰	معـہ ۱۷	عـہ ۲۵

۱۔ کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائٹیل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرست مضامین

محرم ۱۳۵۷ھ ۔ جلد ۱۲ ۔ عدد ۱

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام چودھری نیاز علی خاں پرنٹر و پبلشر طبع ہوا اور دفتر ترجمان القرآن دار الاسلام (پٹھانکوٹ پنجاب) سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس اشاعت سے "ترجمان القرآن" کی زندگی کا چھٹا سال شروع ہو رہا ہے۔ پچھلے سال کے آغاز میں جو دعا میں نے اپنے مالک سے مانگی تھی، اُس وقت ذہن میں اس امر کا تصور بھی نہ تھا کہ سال پورا ہونے سے پہلے ہی ایک ٹوٹی ہوئی کشتی کو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلے میں لے جانے کا حوصلہ فرسا کام میرے سپرد کر دیا جائیگا۔ اُس وقت محض ایک دھندلا سا خیال تھا کہ شائد مستقبل قریب میں ایسی کوئی صورت پیش آجائے، اسلیے میں نے تمنا کی تھی کہ اگر میرا آقا ایسا کوئی بوجھ میرے کندھوں پر رکھنے والا ہے تو اس کو سنبھالنے کی طاقت بھی عطا کرے۔ مجاہد کا سا ایمان دے۔ ایسی روح دے جو شکست کھانے اور سپر رکھ دینے کا تصور ہی نہ کرسکتی ہو۔ ایسی عزیمت دے جو مادّی سہاروں سے قطعاً مستغنی ہو اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹے۔ ایسا ارادہ دے جسے کوئی طاقت اپنے مقصد کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔

آج جب سے اپنے حال پر غور کرتا ہوں، تو پھر ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اور بھی زیادہ لجاجت و الحاح کیساتھ اُسی دعا کا اعادہ کروں۔ اب فی الواقع وہ صورت پیش آچکی ہے جس کا

کے سکون و عافیت سے نکال کر سمندر کے منجدھار میں پھینک دیا گیا ہوں، وہی خواب تصور والی ٹوٹی ہوئی کشتی میرے حوالہ کی گئی ہے جس کا تختہ تختہ الگ، اور جسکے بادبان تار تار ہیں، سب سے بڑا مادی سہارا جس سے مدد کی توقع تھی، اقبال کا سہارا تھا، سو وہ بھی یہاں قدم رکھتے ہی چھین لیا گیا (رحمۃ اللہ وطاب ثراہ)، خود اپنی طاقت کو دیکھتا ہوں تو وہ بمنزلۂ صفر ہے، دو چار ساتھی جو ملے ہیں، ان کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ خستہ و درماندہ ہیں، اور دوسری طرف وہ حال نظر آتا ہے جسکو دیکھ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا کہ رَبَّنَا اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ - اب سوائے خدا کے اور کوئی سہارا نہیں، سب مادی سہارے جھوٹے اور ناقابلِ اعتماد ہیں، وہی اصلی اور حقیقی سہارا ہے، وہی طاقت کا منبع ہے، وہی اسباب کا مالک اور مسبب ہے، اور وہی حامی و ناصر ہے، عَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِکَ مِنَ الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ -

---

زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے، - اسکو ایسے الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا جنکے درمیان کوئی ربط اور کوئی تعامل نہ ہو ——— یہ ایک حقیقت تھی جس کو الٰہی شریعت کے پیغامبروں نے قدیم ترین زمانے سے انسان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی، اور ساتھ یہ بھی اس کو سمجھایا کہ اس ناقابلِ تقسیم وحدت کو گمراہی سے بچانے اور حقیقی ترقی کی راہ پر چلانے کیلیے ایک ایسی ہمہ گیر قوت ضابطہ کی ضرورت ہے جو محض انسان کے اپنے ناقص علم اور اسکی خواہشات نفس پر مبنی نہ ہو بلکہ ہدایتِ ربانی اور قانونِ شرعی پر مبنی ہو۔

انسان صدیوں تک اس حقیقت کو جھٹلاتا رہا۔ زندگی کی وحدت کسی طرح اس کی

سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میرا مذہب میرے دل کی چیز ہے۔ میری معاشرت میرے گھر کی چیز ہے۔ میری معیشت میری دوکان اور میرے کھیت اور میرے کارخانے کی چیز ہے۔ میرے تمدن کا ایک اور دائرہ ہے۔ میری سیاست ایک دوسرے دائرے میں بند ہے۔ اس طرح میں اپنی ہر چیز کو الگ الگ خانوں میں رکھ سکتا ہوں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ یہ سب ایک ہی قوتِ ضابطہ کی گرفت میں آجائیں۔

مدتوں کے تجربات نے آخر کار اس خیال کی غلطی واضح کر دی۔ زندگی کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کی ہر کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ وحدت کے فطری رجحان نے تقسیم کی کسی تجویز کو نہ چلنے دیا، اور ہمیشہ یہی دیکھا گیا کہ جب کبھی زندگی کے کسی اہم شعبہ پر کسی قوتِ ضابطہ کو اقتدار حاصل ہوا تو وہ رفتہ رفتہ زندگی کے تمام شعبوں پر چھا کر ہی رہی، خواہ وہ اس خاص شعبہ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ بالآخر انسان کو ماننا پڑا کہ فی الواقع زندگی اپنے تمام ظاہری شعبوں کے ساتھ ایک ہی مربوط شے ہے، اور اس کو منضبط کرنیکے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی قوتِ ضابطہ کی ضرورت ہے۔

پہلے نکتہ کو تسلیم کرنیکے بعد اب تمام تر جھگڑا دوسرے نکتہ پر رہ گیا، یعنی یہ کہ اُس ہمہ گیر قوتِ ضابطہ (اسٹیٹ) کی نوعیت کیا ہو؟ آیا وہ دینی ہونی چاہیے، یا لادینی؟ اسی مسئلہ کے حل پر اجتماعِ انسانی کی آئندہ شکل و صورت کا انحصار ہے۔ لادینی اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تمدن و معاشرت ہی سے نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ سے دین کا اثر نکل جائے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ دل و دماغ کے ریشے بھی اس سے خالی ہو کر رہیں، خواہ دستورِ اساسی میں دین اور اسکے متعلقات کو محفوظ رکھنے کا کیسا ہی پختہ اور پر خلوص عہد کیا گیا ہو۔ برعکس اس کے دینی اسٹیٹ کے یہ معنی ہیں کہ جسمِ اجتماعی کی ایک ایک رگ اور ایک ایک ریشے سے زندگی

کے مشینی تصور اور حیوانی نصب العین کو نکال باہر کیا جائے۔

اس وقت تمام دنیا کے سامنے یہی ایک بنیادی مسئلہ ہے، اور ہندوستان میں جو سوال پوری قوت کے ساتھ ہمارے سامنے آگیا ہے وہ بھی یہی ہے۔

اسٹیٹ کا وہ تصور اب بالکل فرسودہ ہو چکا ہے جسے انیسویں صدی کے علمائے سیاست بڑے زور و شور سے پیش کرتے تھے کہ "یہ ایک مصنوعی چیز ہے جسے افراد کی حفاظت جان و مال اور انکی شخصی آزادی کو برقرار رکھنے کیلیے وجود میں لایا جاتا ہے"۔ وہ دن اب گذر چکے جب حکومت کی طرف سے اگر کوئی معاشی، تعلیمی، صنعتی، یا معاشرتی اسکیم پیش ہوتی تھی تو اس کو "نانی اماں کے احکام" (Grand motherly legislation.) قرار دیکر اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا، اور حکومت کو مشورہ دیا جاتا تھا کہ اپنے دائرے کے اندر رہے۔ اب صورت حال بدل چکی ہے۔ اب اسٹیٹ کا دائرہ قریب قریب اتنا ہی ہمہ گیر ہو گیا ہے جتنا مذہب کا دائرہ ہے۔ اب وہ یہ بھی فیصلہ کرتا ہے کہ آپ کیا پہنیں اور کیا نہ پہنیں۔ کس سے شادی کریں، کس سے نہ کریں، اور کس عمر میں کریں۔ اپنے بچے کو کیا پڑھائیں، کیا پہنائیں، اور کس قسم کی زندگی کے لیے تیار کریں۔ اپنی گفتگو اور تحریر کے لیے کونسی زبان اور کونسا رسم الخط استعمال کریں۔ غرض اس طرح اسٹیٹ نے اپنے حدود اقتدار میں رہنے والوں کی زندگی کے کسی جزئی سے جزئی معاملہ کو بھی اپنی فیصلہ کن مداخلت سے آزاد نہیں چھوڑا ہے اور اب کوئی حد ایسی مقرر کرنا مشکل ہے جسکے متعلق یہ کہا جا سکتا ہو کہ اسٹیٹ کے اختیارات وہاں جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ خواہ فاشستی اسٹیٹ ہو یا اشتراکی، دونوں میں "کلیت" (Totali-tarianism.) کی شان یکساں نظر آتی ہے۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس

جیسے جمہوری ممالک بھی، جو قدیم سیاسی نظریات کو اب تک سنبھالے ہوئے ہیں، اجتماعی زندگی پر اسٹیٹ کے روز افزوں اقتدار کو تسلیم کرتے جارہے ہیں، اور ہندوستان میں بھی "اسٹیٹ" کا ارتقاء اسی ڈھنگ پر ہو رہا ہے ۔

یہی نہیں بلکہ اسٹیٹ قریب قریب اسی مرتبہ کا مدعی بنتا جارہا ہے جو مذہب میں شارع کو دیا گیا ہے ۔ اسٹیٹ خطا و نسیان سے معصوم ہے ۔ اس سے غلطی کا صدور ممکن نہیں ۔ تمام افراد اسکی ملک ہیں اور ان پر اس کی اطاعت فرضِ عین ہے ۔ اس کو حق ہے کہ جس امر میں جو چاہے فیصلہ کرے ۔ فرد کی پہلی اور آخری وفاداری صرف اسٹیٹ کیلیے ہے، اور اس میں کوتاہی کفر سے کم نہیں ۔

یہ کلیت کا رنگ جو اب اسٹیٹ اختیار کر رہا ہے، اگرچہ وحدتِ حیات کی حقیقت سے قریب تر ہے، مگر یہ اسکے صالح ہونے کا ضامن نہیں ہے ۔ اسکے صالح یا فاسد ہونے کا مدار تمام تر اس سوال پر ہے کہ اسٹیٹ کی قوت کا ماخذ کیا ہے اور اسکی اساس کس قانون پر ہے ۔ اگر وہ قانونِ الٰہی کی بنیاد پر قائم ہو، اور اس کی طاقت کا ماخذ ایک ایسی ترقی یافتہ رائے عام ہو جس میں توسط و اعتدال، اور حق پسندی کی اعلیٰ صفات موجود ہوں، تو ایسے کلی اسٹیٹ سے بڑی کوئی رحمت اس زمین پر نہیں ہوسکتی ۔ لیکن اگر اسکے برعکس اس کی بنیاد انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر ہو، اور اسکی قوت کا ماخذ ایک ایسی قومیت ہو جس پر اقتدار کی حرص اور اپنے استعلاء کی خواہش مسلط ہوگئی ہو تو ایسا کلی اسٹیٹ زمین پر خدا کی سب سے بڑی لعنت ہے ۔ وہ جس قومیت سے وجود میں آئیگا اس سے مختلف قومیت رکھنے والوں کیلیے اسکے دائرے میں زندگی گذارنا محال ہو جائیگا ۔ وہ اپنی کلیت کی پوری طاقتیں ان کے امتیازی وجود کو فنا کرنے میں صرف کردیگا، اور اسکی مہلک دخل اندازی سے ان کا دین، انکی تہذیب، انکا

اخلاق، انکی معاشرت، انکی زبان، ان کا ادب، غرض کوئی چیز محفوظ نہ رہیگی۔ اشتراکی روس نے روسی مسلمانوں کے وجود قومی کو مٹانے کیلیے جو کچھ کیا، فرانسیسی امپیریلزم نے تونس، الجزائر، اور مراکش کے عربوں کو فرنچ قومیت اور فرنچ تہذیب میں جذب کرنے کیلیے جو کچھ کیا، زیکوسلوواکیا میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک جرمن اور ہنگرین آبادی کی قومیت فنا کرنیکے لیے جو تدبیریں کی جارہی تھیں، نازی جرمنی میں یہودی قومیت کیساتھ جو برتاؤ ہو رہا ہے ان سب مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نوعیت کا ہمہ گیر اسٹیٹ اپنے اصول سے مختلف اصول رکھنے والوں کیلیے کیا کچھ بن سکتا ہے۔

قدیم فرعونیت قومی امپیریلزم کی صرف ایک ہی شکل سے واقف تھی، یعنی ذبح اطفال۔ مگر جدید فرعونیت کے پاس ایک قوم کو آہستہ آہستہ تحلیل کرنے (Denationalisation) کے بیسوں ہتھیار ہیں، مثلاً قوم پرستی کی تبلیغ، تعلیم کے ذریعہ سے تہذیب کے بنیادی تصورات کو بدل دینا، قانون سازی کے ذریعہ قوانین معاشرت کو مسخ کردینا، معاشی پالیسی کے ذریعہ دل و دماغ اور دست و پا کو خریدنا، اور جو خریدے نہ جاسکیں انہیں بھوکا مار دینا، انتخابات کا ایسا نظام مقرر کرنا جس میں قلیل التعداد جماعت کی آواز قطعاً گم ہو کر رہ جائے، اور ایسی ہی بکثرت دوسری تدبیریں، جن کو آج کل کا ایک ہمہ گیر اسٹیٹ بڑی آسانی سے اختیار کرسکتا ہے، اور کر رہا ہے۔

ہندوستان میں ہمارے سامنے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہم کو نماز پڑھنے دی جائے اور روزہ رکھنے دیا جائے یا ہماری مسجدوں کو کھڑا رہنے دیا جائے، یا ہمیں اردو بولنے اور لکھنے سے نہ روکا جائے، وَاَشْیَائُ اُخر من ہذا القبیل۔ لہذا وہ بنیادی حقوق جن کو بار بار

ٹھیرایا جاتا ہے، اور جن کی بنا پر ہمارے عالی مرتبت مذہبی پیشوا بھی جگہ جگہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ "کانگریس تمہارے مذہبی و ملی حقوق کی محافظ ہے" قطعاً بے معنی ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہاں جو اسٹیٹ پیدا ہو رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔ اگر اس کی نوعیت اسی دوسری قسم کی ہو جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اور ہم اس کو وجود میں آجانے دیں، یا خود اسکے قیام میں مدد دیں تو یہ ہمارے لیے قومی خودکشی کا ہم معنی ہوگا۔ ایسے اسٹیٹ میں بنیادی حقوق کی فہرست اگر کراچی کی فہرست سے ہزار گنی زیادہ طویل بھی ہو تو وہ بے کار ہوگی۔ اس کی حیثیت محض ایک افیون کی سی ہوگی کہ اسکی پینک میں ہم اطمینان سے پڑے سوتے رہیں، اور ایک لادینی اسٹیٹ پُرامن نفوذ (Peaceful penetration.) کے ذرائع استعمال کر کے ہندوستانی مسلم قوم کو پچاس سال کے اندر اندر پوری طرح تحلیل کر دے۔ ایسا اسٹیٹ اگر وجود میں آرہا ہے تو اس صورت میں ہمارے سامنے سوال یہ نہ ہوگا کہ اس اسٹیٹ میں ہماری حیثیت کیا رہیگی —— اسلیے کہ حیثیت جو رہیگی وہ تو اظہر من الشمس ہے —— بلکہ سوال یہ ہوگا کہ ان ابتدائی مراحل میں اس بچۂ فرعون کے نشو و نما کو روکنے اور اس کو ضائع نہیں تو کم از کم غیر فاسد بنانے کی صحیح صورت کیا ہے —— آج اسی نقطۂ نظر سے ہم حالات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک ہندوستانی اسٹیٹ، یا وطنی حکومتِ خود اختیار کی پیدائش اس طور پر نہیں ہو رہی ہے جس طرح ایک شخص کسی شخص کو مار کر اسکی جگہ لیتا ہے، بلکہ اس طرح ہو رہی ہے جیسے ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں ایک اسٹیٹ کو فنا کر کے دوسرا اسٹیٹ نہیں بنایا جا رہا ہے، بلکہ ایک اسٹیٹ کے اندر سے دوسرا اسٹیٹ آہستہ آہستہ

نکل رہا ہے۔ دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کیلیے کہا تو یہی گیا تھا کہ ہم آزادی کامل چاہتے ہیں، اور برٹش انڈین حکومت کو فنا کر کے اسکی جگہ ایک آزاد حکومت قائم کرینگے مگر جو تصورات اب سے دس برس پہلے نہرو رپورٹ کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے ان میں سرِمو فرق نہیں آیا ہے۔ جدید دستور کی رو سے صوبوں میں جو حکومت خود اختیاری قائم کی گئی ہے، اس کو قبول کیا جا چکا ہے، اور اب وفاقی اسکیم کو قبول کرنے میں جو کچھ تامل ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اسکے چند اجزاء قابلِ اعتراض ہیں۔ وہ اگر نکال دیے جائیں تو دستور جدید کا یہ حصہ بھی اسی طرح قبول کر لیا جائیگا جسطرح پہلا حصہ قبول کیا گیا۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آزادی کامل کا راستہ ہے؟

اس طور پر جو اسٹیٹ کسی اسٹیٹ کے اندر سے پیدا ہوتا ہے، لامحالہ وہ اپنے مورث کی روایات اور اسکی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، بالکل اسی طرح، جسطرح بچہ اپنی ماں اور اپنے باپ کے ورثہ کا حامل ہوا کرتا ہے۔

اور بات صرف یہیں تک نہیں ہے کہ یہ ہندوستانی اسٹیٹ اپنی انگریزی ماں کے پیٹ سے برآمد ہو رہا ہے۔ بلکہ درحقیقت اس بچے کا حمل بھی انگریزی نظریات و افکار ہی کے نطفہ سے قرار پایا تھا۔ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کا تخیل پیدا ہی اُس مغربی تعلیم سے ہوا جو انگریزی زبان اور انگریزی حکومت کے بنائے ہوئے نظام تعلیم کے واسطے سے ہندوستان تک پہنچی تھی۔ اس بنا پر لازماً یہ تخیل اُنہی سیاسی نظریات اور اُنہی روایات کے خمیر سے پیدا ہوا جن کا نشوونما انگلستان کے مخصوص ماحول اور اینگلوسیکسن قوم کے مخصوص حالات میں ہوا ہے۔

پھر اس تخیل کو صورتِ فعل میں لانے کا سہرا بھی حقیقت میں انگریزی دماغ، بلکہ انگریزی حکومت ہی کے سر ہے۔ مسٹر اے او ہیوم (Hume.) پہلے شخص تھے جنکے ذہن میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کرنیکا خیال آیا۔ ابتداءً ان کے پیشِ نظر صرف یہ بات تھی کہ ہندوستان کے سیاسی دماغ سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا کریں، اور جس صوبہ میں ان کا اجتماع ہو وہیں کا گورنر جلسہ کی صدارت کرے۔ لارڈ ڈفرن جو اس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے، انہوں نے اس تجویز کو ناپسند کیا، اور یہ رائے دی کہ ہندوستان میں ایسی ایک جماعت ہونی چاہیے جسکی حیثیت یہاں ویسی ہی ہو جیسی انگلستان میں حزب الاختلاف (Opposition.) کی ہے، تاکہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کرکے اس کے نقائص دور کرے۔ نیز اس جماعت کو مستقل بالذات ہونا چاہیے۔ گورنر کی صدارت اسکی آزادی رائے میں خلل انداز ہوگی۔ لارڈ ڈفرن کی اس رائے کو مسٹر ہیوم نے انگلستان کے عمائد سیاست کے سامنے پیش کیا، اور اکثر نے اس کی تائید کی۔ ان میں لارڈ رپن اور لارڈ ڈلہوزی بھی شامل تھے (ملاحظہ ہو ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیّا ممبر کانگریس ورکنگ کمیٹی کی کتاب "ہسٹری آف کانگریس"، صفحہ ۲۳ و ۲۵)۔

کہا جاتا ہے کہ اب "قومی تحریک" کی نوعیت میں انقلابِ عظیم واقع ہوگیا ہے۔ صورت ظاہری کو دیکھتے ہوئے تو ہم بھی کہینگے کہ ہاں، واقعی انقلاب ہوگیا ہے۔ مگر یہ انقلاب ویسا ہی ہے جیسا ایک شخص کی حالت میں شیر خوارگی سے ۵۳ برس کی عمر کو پہنچنے تک ہوا کرتا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ قد و قامت، سمجھ بوجھ، افکار و تخیلات، اور افعال و حرکات میں کیا انقلاب ہوا؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا اس کی فطرت بدل گئی؟ آج ۵۳ برس کے بعد بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ باایںہمہ شور و غوغا اس تحریک کی حیثیت برطانی سلطنت کے

اندر اُسی حزب الاختلاف کی سی ہے جس کا تخیل لارڈ ڈفرن نے پیش کیا تھا۔ یہ کوئی انقلابی تحریک نہیں ہے جسکا کام ایک سلطنت کو مٹا کر دوسری مختلف الاصل سلطنت قائم کرنا ہو۔ بلکہ یہ ایک حزب الاختلاف ہے جو ایک ہی نظام سلطنت کے اندر برسر اقتدار پارٹی کو شکست دیکر اپنی وزارت قائم کرتی ہے۔ حکومت تو ضرور بدل جاتی ہے، مگر اسٹیٹ کا ڈھانچہ وہی کا وہی رہتا ہے —— آٹھ برس پہلے لاہور میں آزادیٔ کامل کا جو ڈھونگ رچایا گیا تھا، اس سے دھوکا کھانے والے صرف بلید الذہن تھے، مگر آج بیّن حقائق کے ظاہر ہو جانے پر بھی جو دھوکا کھاتا ہے، اسکی بینائی کا ماتم کرنا چاہیے۔

قانون فطرت کے مطابق اس "بچۂ فرعون" کو اپنی ماں اور باپ سے بہت سی خصوصیات اور روایات ورثہ میں ملی ہیں، مگر یہاں ان سب کو نمایاں کرنیکے بجائے میں تین اہم ترین چیزوں کا ذکر کرونگا۔ وطنی قومیت۔ ڈیماکریسی (جمہوریت) کا انگریزی ماڈل، اور حکومت کا پارٹی سسٹم —— یہ تین چیزیں مل کر وہ خوبصورت جال تیار کرتی ہیں جن میں بے وقوف مکھی جا پھنستی ہے، اور پھنس جانیکے بعد پھر وہ لاکھ بھنبھنائے اور پھڑپھڑائے، آخر کار اسے طوعاً و کرہاً مکڑی کا جزو بدن بننا ہی پڑتا ہے۔

ہر شخص ایک نظر میں دیکھ سکتا ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان، دو بالکل مختلف قومیں رہتی ہیں، جنکے درمیان، ایک ہی جغرافی خطّہ اور ایک ہی آب و ہوا میں آٹھ نو سو برس رہنے کے باوجود، خطِ امتیاز اس قدر واضح ہے کہ جرمن، اٹالین اور فرنچ قوموں کے درمیان بھی اتنا واضح خطِ امتیاز نہیں پایا جاتا۔ مذہبی عقائد، نظریۂ حیات، انداز فکر، امیال و عواطف (Sentiments)، اصول تہذیب، طریق زندگی، نظام تمدن و معاشرت

غرض وہ تمام چیزیں جنکے اشتراک سے ایک قوم بنتی ہے، ان کے درمیان نہ صرف یہ کہ مختلف ہیں، بلکہ باہم متعارض بھی ہیں۔ ہندوؤں میں ایک مسلمان، اور مسلمانوں میں ایک ہندو اس سے زیادہ اجنبیت محسوس کرتا ہے، جتنی انگلستان میں ایک جرمن محسوس کرتا ہے۔ یہ ایسی بیّن چیز ہے کہ اس کو دیکھتے ہوئے کوئی مرد عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندو، ہندو رہتے ہوئے، اور مسلمان، مسلمان رہتے ہوئے، ایک قومیت بنا سکتے ہیں۔ آزادی وطن کیلیے ان کے درمیان ایسا ایک "بین الاقوامی وفاق" تو ضرور ممکن — اور حصول مقصد کیلیے مفید بھی — ہے، جسمیں دونوں کے حقوق اور حدود کی نگہداشت کیساتھ، مشترک مقاصد کیلیے مشترک جدوجہد اور تعاون ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قومی خصوصیات باقی بھی رکھیں، اور پھر ایک قوم بھی بن جائیں۔ اسلیے کہ قومیت صرف ایسے ہی امور کے اشتراک سے بنتی ہے جو لوگوں کی نگاہ میں مختلف فیہ امور کی بہ نسبت زیادہ اہم ہوں، جنکی حیثیت زندگی میں اساسی امور (Fundamentals) کی ہو، اور جنکے محور پر گھومتے گھومتے آخر کار نظریات، افکار، عواطف، اصول تہذیب، طریق زندگی، اور نظام تمدن و معاشرت سب کے سب ایک مشترک سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں۔ اگر اسلام اور پرانی ہندویت کے بجائے آزادی وطن کی طلب، اور انگریز کو شکست دینے کا جذبہ اور وطن کو بہر صورت سربلند کرنیکا داعیہ اہم تر ہو اور اساسی چیز بن جائے، تو بلاشبہ اس کا اشتراک انکو ایک قوم بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر اس صورت میں وہ عقائد اور اصول یقیناً بدل جائینگے جنکی حیثیت انکی زندگی میں اساسی نہ رہیگی اور جنکی اہمیت، اُس چیز کے مقابلہ میں کم تر ہو گی جسے وہ بنائے قومیت قرار دیں گے — اغلب ہے کہ ہندو پھر بھی ہندو رہیگا، کیونکہ ایک منکر خدا اور دہریے سے لیکر ایک کٹّے سناتن دھرمی تک، دونوں یکساں ہندو ہو سکتے ہیں، مگر ایسی صورت میں مسلمان کا

مسلمان رہنا تو قطعاً محال ہے۔ آج کا مسلمان شائد کسی حد تک ذو حیاتین بننے میں کامیاب بھی ہو جائے مگر اسکے بیٹے اور پوتے تک نوبت پہنچتے پہنچتے اسلامیت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

قومیت کی اس حقیقت کو سامنے رکھیے، اور اس بات کو بھی نہ بھولیے کہ اس قسم کی قومیت اگر بن جائے تو ہندو کی ہندویت برقرار رہتی ہے البتہ مسلمان کی مسلمانیت ختم ہو جاتی ہے، اور اگر فی الواقع نہ بنے لیکن اسکو بنا ہوا فرض کر کے کام کیا جائے تو اس میں سراسر اُس قوم کا فائدہ ہے جو اکثریت میں ہو کیونکہ یہ مفروضہ قلیل التعداد قوم پر کثیر التعداد قوم کے امپیریلزم، استبداد، اور جلبِ منفعت (Exploitation.) کو پوری طرح مسلط کر دینے کا بہترین وسیلہ بن سکتا ہے ـــــ ان دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھیے کہ یہاں کیا پالیسی اختیار کی جا رہی ہے۔

۱۸۸۵ء میں جب اس تحریک کی بنا رکھی گئی تھی، اُسی وقت یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ ہندوستان ایک قوم بن چکا ہے، چنانچہ کانگریس کا نام ہی انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ پہلے اجلاس میں کانگریس کے جو چار مقاصد تجویز ہوئے تھے، ان میں سے دوسرا مقصد یہ تھا:

> "قومی وحدت کے اُن داعیات کا نشوو ارتقاء اور استحکام جو ہمارے محبوب لارڈ رپن کے ہمیشہ یادگار رہنے والے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے ہیں (تاریخ کانگریس ۔ صفحہ ۲۷)

دوسرے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:

"ایک قومی کانگریس کو ان امور تک اپنے تئیں محدود رکھنا چاہیے جن میں پوری قوم براہِ راست حصہ دار ہو۔ اور اصلاح معاشرت اور دوسرے طبقہ وار مسائل کو طبقات کی کانگریسوں کیلیے چھوڑ دینا چاہیے"!

گویا انگریزی تاریخ، انگریزی روایات اور انگریزی ذہنیت سے یہ سبق حاصل کیا گیا کہ ایک جغرافی خطہ میں رہنے والی پوری آبادی کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے، اور اگر وہ فی الواقع ایک قوم نہ ہو تو اسے ایسا فرض کر لینا چاہیے، اور مختلف قومیں جو وہاں رہتی ہوں انکو "اقوام" کہنے کے بجائے ایک قوم کے "طبقے" یا فرقے کہنا چاہیے۔

ابتداءً یہ چیز ایک بالکل بے ضرر سی چیز نظر آتی تھی۔ خیال ہوتا تھا کہ یہ محض الفاظ کا غلط استعمال ہے۔ لیکن تیس چالیس برس تک نشو و نما پانے کے بعد یہ ایک خطرناک چیز بن گئی۔ اب اس مفروضہ نے جو صورتیں اختیار کی ہیں انکی چند جھلکیاں دیکھ کر ہی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ فتنہ کس رفتار سے بڑھ رہا ہے اور کہاں تک پہنچنا چاہتا ہے :

اسلامی تہذیب و تمدن، مسلمانوں کے قومی حقوق، انکی قومی زبان اور ادب، انکی خصوصیات معاشرت، غرض انکی کسی چھوٹی یا بڑی امتیازی چیز کو برقرار رکھنے کی جو کوشش بھی کی جاتی ہے، اسے علحدگی پسندی کا رجحان (Separatist tendency) کہکر قابل ملامت ٹھیرایا جاتا ہے۔ اسکی بنا یہی قومیت کا مفروضہ ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ "قوم" تو بنی ہوئی موجود ہے۔ اب جو شخص اس قوم میں تفرقہ پیدا کرنے اور کسی جزو کو الگ کرنیکی کوشش کرتا ہے وہ قابلِ ملامت ہے"۔ "فرقہ پرستی" کا لفظ بھی اسی معنی کو ادا کرنیکے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، اور یہ بھی ان گالیوں میں سے ایک ہے جنہیں قوم پرستی کی زبان نے ایجاد کیا ہے۔ "رجعت پسندی" کا

لفظ بھی دراصل اس معنی کیلیے استعمال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے باشندے جس قومیت کیطرف "ترقی" کر رہے ہیں، اس سے روک کر انکے کسی "فرقے" کو پرانی جداگانہ قومیت کیطرف لے جانا "رجعت پسندی" اور ایک سراسر مذموم حرکت ہے (ہمارا مولوی بے چارہ ان معانی سے تو بالکل ناواقف ہے البتہ جب وہ اخبارات میں اور قوم پرستوں کی تقریروں میں کثرت سے یہ الفاظ دیکھتا سنتا ہے، تو بس اتنا سمجھ لیتا ہے کہ "رجعت پسند" اور "فرقہ پرست" کسی بہت برے آدمی کو کہتے ہونگے۔ چنانچہ اب وہ بھی اپنی ترقی پسندی اور سیاسی روشن خیالی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ان الفاظ کو استعمال کرنے لگا ہے)

اسی مفروضہ کی بنا پر تعلیم میں اسلامی تہذیب کے عنصر کو شامل کرنے کی مخالفت کی جاتی ہے، کیونکہ انکے نزدیک یہ چیز مسلمانوں کو "ہندوستانی قوم" میں جذب ہونے سے روکتی ہے۔ چنانچہ یو۔پی کے وزیر تعلیم سوامی سمپورنا نند صاحب نے ۴ اپریل ۳۸ء کو یو۔پی اسمبلی میں جو تقریر فرمائی ہے، اس میں وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> "ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اسکو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے، وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں یہ چیز مفقود ہونی چاہیے۔ ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کیلیے، جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اسے اپنا گھر بنا لیا ہے، بالکل ایک ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کی ترقی میں کوشاں ہے تو اسکو ایسی بات پر زور دینا چاہیے جس سے ہم میں تفرقے پیدا نہ ہوں جو سب کیلیے ضرر رساں ہیں۔ ایسے امور ہوں جن سے ہندوستانی تہذیب کی تعمیر و ترکیب ہوتی ہو۔ تمام وہ باتیں جن سے ہم میں تفرقہ اور کشیدگی ہوتی ہے یقیناً ملک کے

ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔ اسلیے ملک کا عام مفاد مدِّنظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو اور مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس بات پر زور نہ دینگے" (مدینہ - مورخہ ۱۲ اپریل ۳۸ء)

اسی تقریر کا ایک حصہ جسکو ادارۂ مدینہ نے شائد بعض مصالح کی بنا پر حذف کر دیا ہے، ۱۵ اپریل کے ٹریبیون میں بدین الفاظ شائع ہوا ہے:

"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائینگی، تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکیگی"

یہ ایک بڑے صوبے کے وزیر تعلیم کا بیان ہے، جو ہماری آئندہ نسلوں کیلیے تعلیمی پالیسی متعین کر رہا ہے۔ یہی تعلیمی پالیسی صوبۂ متوسط کی "ودیا مندر" اسکیم میں نافذ کی جا رہی ہے، جسے خود گاندھی جی حال میں "برکت" عطا فرمائی ہے یہی پالیسی تمام ہندوستان کیلیے واردھا کی تعلیمی اسکیم میں تجویز کی گئی ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس اسکیم کے مصنف ہماری اُس یونیورسٹی کے شیخ صاحب ہیں جو انگریزی یونیورسٹیوں سے بغاوت کر کے "جامعۂ ملیہ اسلامیہ" کے نام سے قائم کی گئی تھی، تاکہ ہم اپنی ملت کے بچوں کو ملی نصب العین کے تحت دماغی نشو و نما دے سکیں!

اسی مفروضہ کے تحت قوانین معاشرت کو توڑنے اور ہندو مسلمان کو خلط ملط کرنیکی عملاً ہمت افزائی کی جا رہی ہے، کیونکہ جب دونوں ایک ہی قوم ہیں تو انکے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہنی چاہیے۔ حال میں مس حمیدہ طیب جی نے جب مسٹر شنکر لال بینکر کے بھتیجے سے شادی کی تو مہاتما گاندھی نے اسی مفروضہ کی بنا پر اپنی "برکتیں" بذریعہ تار ارسال فرمائیں (ملاحظہ ہو نیشنل کال دہلی - مورخہ ۷ اپریل ۳۸ء)۔ ابھی تک یہ محض انفرادی واقعات ہیں مگر "متحدہ قومیت" جس طرح علمائے کرام کے زیر سایہ پرورش پا رہی ہے، اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ پچاس سال بعد یہ روزمرہ کے معمولی واقعات ہونگے۔

(باقی)

مقالات

اشتراکیت اور مذہب و اخلاق

(از جناب محمد فضل الرحمٰن صاحب انصاری بی۔ اے (علیگ۔))

[ذیل کا مضمون سنگاپور کے رسالہ (Genuine Islam) سے ترجمہ کر کے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ اشتراکی فتنہ جس تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے اس کو روکنے کیلیے ضروری ہے کہ اس قسم کے مضامین کثرت کیساتھ شائع کیے جائیں تاکہ عامۂ مسلمین اور خصوصاً انکے علمار اس مسلک کی حقیقت سے واقف ہو جائیں۔

فاضل مضمون نگار ابھی تک اس غلط فہمی میں ہیں کہ اشتراکیت کا طاعون صرف نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی میں سرایت کر رہا ہے۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ اب یہ جراثیم ہمارے "آزادی پسند" علما کی جماعت میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ یہ بے چارے علمار اشتراکیت کے اصل ماخذ تک تو پہنچ نہیں سکتے۔ ان کی معلومات کا تمام سرمایہ صرف ان لوگوں کے بیانات ہیں جو کانگریس کی خدمت میں ان کے شریکِ کار ہوتے ہیں اور انہیں دور سے اشتراکیت کے سراب دکھاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ان شرکارِ کار کے جادو سے مسحور ہو کر اب مولویوں نے بھی اشتراکیت کے سُر میں سُر ملانا شروع کر دیا ہے۔ ابھی ہم نے سنا کہ جمعیت العلمار کے ایک ذمہ دار رکن جو اس سے پہلے جمعیت کے نائب ناظم بھی رہ چکے ہیں، چشمِ بد دور، قرآن سے اشتراکیت ثابت فرماتے ہیں۔

ایک اور صاحب جن کا شمار ہندوستان کے مشہور مذہبی لیڈروں میں ہوتا ہے، صوبۂ متحدہ میں اشتراکیت کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ ایسے بے علم علماء اگر خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کا حقیقی اعتقاد رکھتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ پہلے علم حاصل کریں، پھر زبان کھولنے کی جرأت کریں]

اسلامی دنیا اس وقت ایک ایسے نازک دور سے گذر رہی ہے جو اسلام کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسلامی تخیل عموماً داغوں سے نکل گیا ہے، اور اسلامی زندگی کے نظم و ضبط سے بے پروائی بھی عام ہے۔ آجکل ایک اوسط درجہ کا مسلمان، اسلام کو یا تو چند رسموں کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے، یا پھر ایک مبہم و غیر متعین اُفتادِ ذہنی خیال کرتا ہے، جس کا کوئی تعلق زندگی کے اہم مسائل سے نہیں ہے۔ وہ اس زبردست حقیقت کو قریب قریب بھول ہی گیا ہے کہ اسلام ایک مستقل تہذیبی نظام ہے، زندگی کا ایک ایسا جامع دستور العمل ہے جسکے احاطہ سے کوئی چیز بھی خارج نہیں۔

ایک طرف اسلام کے متعلق یہ غلط خیال ہے اور دوسری طرف خود اپنے آپ کو حقیر سمجھنے والی شکست خوردہ ذہنیت ہے، جس میں اسلامی دنیا اپنے سیاسی زوال کے بعد سے مبتلا ہے، اور جسکے اثر سے مسلمان روز بروز مغرب کی غیر اسلامی تہذیب کا زیادہ اور زیادہ اثر قبول کرتے جارہے ہیں۔ ان دونوں چیزوں نے مل جل کر خیالات کی دنیا میں ایک شدید خوفناک اختلال و انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اسلامی اور غیر اسلامی چیزوں کے درمیان امتیاز کرنیکی قوت تیزی کیساتھ مفقود ہوتی جارہی ہے، اور ہم ہر نئے تخیل کی رو میں بآسانی بہ نکلنے کیلیے تیار ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ اس تخیل میں نرالا پن ہو اور وہ مغرب کی طرف سے آرہا ہو۔

اسکی ایک تازہ مثال ہمارے نوجوانوں کے ایک طبقہ میں اشتراکیت (کمیونزم) کی اشاعت ہے۔

ابھی اس جدید تحفہ کو آئے چند ہی سال ہوئے ہیں کہ ہاتھوں ہاتھ ہماری نئی تعلیمیافتہ نسل نے اسکو لینا شروع کردیا - ان میں سے ایک گروہ تو ایسا ہے جو جان بوجھ کر اشتراکیت کو ایک الگ "مذہب" سمجھتے ہوئے قبول کر رہا ہے، مگر بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے محض ظاہر میں یہ دیکھکر کہ اسلام اور اشتراکیت دونوں سرمایہ داری اور امپیریلزم کے خلاف ہیں، دونوں غریب طبقوں کی رفاہیت چاہتے ہیں، اور دونوں انسانی مساوات کے داعی ہیں، یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور مسلمان بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور اشتراکی بھی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع بھی کر سکتا ہے اور مارکس کا بھی۔

مگر کیا یہ حقیقت ہے؟ اشتراکیت کے عقائد کا ایک سادہ بیان ہی یہ ثابت کرنیکے لیے کافی ہے کہ ان دونوں میں بعد المشرقین کی نسبت پائی جاتی ہے۔ اشتراکیت عین ضد ہے اسلام کی۔

اشتراکیت کا مقصد موجودہ زمانہ کی اشتراکی تحریک، جسکا مرکز روس ہے، اور جسکا جال تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے، ۱۸۴۷ء میں شروع ہوئی تھی، جبکہ برسلز (Brussels) میں جرمن دوروں کی سوسائیٹی نے "اشتراکی اعلان" (Communist Manifsrto) شائع کیا - یہ جماعت پہلے "انجمن اہل عدل" (League of theJust) کے نام سے موسوم تھی - پھر اس نے اپنا نام مشترکین (Communes) رکھ لیا - جدید "معاشی مذہب" کے داعی کارل مارکس اور انجلز (Engels) نے اسکا اعلان مرتب کیا اور یہی اعلان اشتراکی تعلیمات کی اساس قرار پایا۔

تاریخ میں اس سے پہلے ایک اور اشتراکی تحریک کا بھی پتہ چلتا ہے جسکی بنا چھٹی صدی عیسوی میں مزدک ایرانی نے رکھی تھی - اس پرانی اشتراکیت کے دو اصول تھے (۱) مال و دولت میں تمام انسانوں کی مساوات - (۲) تمام عورتوں کا تمام مردوں کیلیے مباح ہونا - اس دوسری اصل نے خصوصیت کیساتھ فواحش کا ایک سیلاب عظیم یکایک برپا کردیا، جس سے ایک عام اضطراب رونما ہوا اور آخر بہت جلدی یہ تحریک فنا کردی گئی ۔

جدید اشتراکیت ابتداءً میں محض ایک معاشی نظریہ کی حیثیت سے پیدا ہوئی جسکا مقصد اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ شخصی ملکیت کو ختم کرکے دولت اور اسکے وسائل آفرینش کو سب لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا جائے، لیکن رفتہ رفتہ وہ معاشیات کی حد سے نکلنے پر مجبور ہو گئی، کیونکہ زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط ہیں، کسی ایک شعبے میں کوئی بنیادی انقلاب بغیر اسکے نہیں ہو سکتا کہ تمام دوسرے شعبوں کو اُدھیڑ کر از سرِ نو مرتب کیا جائے۔ اسی بنا پر اشتراکیت کو پوری انسانی زندگی کیلیے ایک ایسا نظریہ، اور ایک ایسا ایجابی فلسفہ وضع کرنا پڑا جس میں یہ جدید انقلابی نظم معیشت کھپ سکتا ہو۔ اور چونکہ معاشی اشتراکیت کی تہ میں مادّیت کے سوا کوئی دوسری بنیاد نہ تھی، اسلیے جو نظریہ حیات اور نظام فلسفہ اسکی فطرت سے مناسبت پیدا کرنیکے لیے وضع کیا گیا، وہ سراسر ایک مادہ پرستانہ (Materialistic) نظریہ اور نظام بنکر رہا، اور اسکو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اب جس اشتراکیت سے ہم دو چار ہیں، یہ محض غریبوں اور مفلسوں کے معاشی مسائل کا حل ہی نہیں ہے، بلکہ اسکے ساتھ وہ اخلاق، تمدن و تہذیب، اور مابعد الطبیعی تخیلات کا ایک مستقل نظام بھی ہے، اور کوئی شخص اس پورے نظام کو قبول کیے بغیر محض اشتراکی معاشیات کو اختیار نہیں کر سکتا۔

ایک طرف خالص مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات، اور دوسری طرف غریب و مفلس مصیبت زدہ انسانوں کیساتھ ہمدردی کا شریف روحانی جذبہ! ان دونوں میں آخر کیا ربط ہے؟ اس سوال نے بہت سے لوگوں کو پریشانی میں ڈالا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے عجائب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اشتراکیت ان دونوں متضاد چیزوں کو ایک نظام میں جمع کرنا چاہتی ہے۔

وہ آخر ان دونوں کو جمع کیوں کرنا چاہتی ہے؟ حیرت زدہ آدمی پھر یہ سوال کریگا۔ اسکا سرسری جواب یہ ہے کہ اشتراکیت کا ان دو متضاد چیزوں کو جمع کرنا کچھ اس بنا پر نہیں ہے کہ ان

دونوں میں کوئی حقیقی ربط دریافت ہوگیا ہے، بلکہ دراصل کئی صدیوں کے دوران میں حالات کا ارتقار جس راستہ پر ہوتا رہا ہے اسکے دباؤ نے مزدوروں کیساتھ ہمدردی رکھنے والے لوگوں کو آخر کار مادّہ پرستی کا امام بنا کر چھوڑا ہے۔ یورپ میں جب اسلام کے اثر سے عقل وحکمت کی روشنی پہنچی تو مسیحیت نے اسکی مزاحمت کی۔ اس مزاحمت نے عقل وحکمت کے داعیوں کو پہلے مسیحیت سے، پھر مذہب سے، پھر مذہبی اخلاقیات سے بعید اور بعید تر کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ سائنس اور فلسفہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ یورپ پر مادّیت بھی چھاتی چلی گئی۔ جس وقت محنت پیشہ طبقوں میں بیداری پیدا ہوئی وہ وقت ایسا تھا کہ یورپ کے افکار اور اسکے تمدن و تہذیب میں مادّہ پرستی جڑ تک اتر چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو علمار اور مفکرین محنت کش طبقوں کی اصلاح حال کیلیے اٹھے ان کو حلِ مشکلات کیلیے مادّیت کے سوا کوئی اور بنیاد ہی نہ مل سکی۔ کارل مارکس جو بجا طور پر اشتراکیت جدیدہ کا باپ کہا جاتا ہے، مذہب کا سخت دشمن اور ایک شدید مادّہ پرست شخص تھا۔ اس پر مزید یہ کہ وہ یہودی النسل بھی تھا جسے مسیحیت کی نفرت اپنے باپ دادا سے ورثہ میں ملی تھی۔ ان دو اسباب کے ساتھ خود مسیحیت کے اپنے نقائص بھی مل گئے۔ سب کے امتزاج سے جو نتیجہ برآمد ہوا وہ یہ تھا کہ ابتدا ہی سے مارکس نے اشتراکی تحریک کو مادّہ پرستی اور لادینی کی راہ پر ڈال دیا۔ مذہب کے خلاف اشتراکیت کے عناد نے اسوقت اور بھی زیادہ شدت اختیار کی جب روس میں اس تحریک کا مقابلہ زار کی سلطنت اور مسیحی چرچ کے ناپاک اتحاد سے ہوا۔ وہاں مسیحیت اور زاریت دونوں ایک دوسرے سے ہم رشتہ تھے اور دونوں مل کر باشندگان ملک کا خون چوس رہے تھے۔ انہوں نے اپنی متحدہ طاقت سے اشتراکیت کا سر کچلنے کی کوشش کی، اور اشتراکیت انتہائی تلخی و نفرت کیساتھ دونوں سے برسرِ آزما ہوئی۔ آخر کار جب ۱۹۱۷ء میں زار کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور لینن کی اشتراکی جماعت وہاں برسرِ اقتدار آئی تو اس نے سوویٹ یونین کے حدود میں مذہب کو بزورِ شمشیر مٹا دینے

کا عزم کرلیا، اور تمام دنیا میں سرمایہ داری اور مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔

یہ بات کہ اشتراکیت خدا کی دشمن ہے، اور خدا پرستی سے اسکی مصالحت غیر ممکن ہے، یہ اب ایسی ایک یقینی بات ہو چکی ہے جسکے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ کتاب "گاندھی اور لینن" کا مصنف لکھتا ہے کہ "لینن اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ اشتراکی عوام اور انکے لیڈروں کو اپنی پوری طاقت خدا کو بے دخل کرنے پر صرف کر دینی چاہیے، کیونکہ اشتراکی نظامِ اجتماعی کا سب سے بڑا دشمن یہی خدا ہے"۔

مزدوروں کے ماہوار جریدہ (Labour Monthly) مورخہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں خود لینن کے یہ الفاظ شائع ہوئے ہیں:۔

"مذہب لوگوں کیلیے افیون کا حکم رکھتا ہے۔ مارکسی مسلک کی نگاہ میں اس وقت کے تمام مذاہب اور مذہبی نظام دراصل متوسط خوشحال طبقہ کی رجعت پسندی کے آلاتِ کار ہیں، اور محنت کش طبقہ کو فریب دینے اور لوٹنے کیلیے دھوکے کی ٹٹی کا کام دیتے ہیں"۔

ایک اشتراکی مصنف بخارین پرایوبرازنسکی (Buharin Priobrazhensky) اپنی کتاب اشتراکیت کی الف بے (A.B.C. of Communism) میں لکھتا ہے:

"یہ اشتراکی جماعت کا کام ہے کہ اس صداقت (یعنی کارل مارکس کے اس قول کی صداقت کہ مذہب لوگوں کیلیے افیون کا حکم رکھتا ہے) کو محنت کش عوام کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچائے اور انکے ذہن نشین کردے۔ .... مذہب اور اشتراکیت دو بالکل متضاد چیزیں ہیں، نظری حیثیت سے بھی اور عملی حیثیت سے بھی .... جو اشتراکی اپنے ساتھ مذہبی عقیدہ بھی ... لیے ہوئے چلتا ہے اس کو درحقیقت اشتراکیت سے کوئی واسطہ نہیں"۔

روس کا پرجوش حامی، پروفیسر ہیکر (Julius F. Hacker) اپنی کتاب

) Religion under the Soviet) میں لکھتا ہے:-

"اشتراکی محض لامذہب اور مادہ پرست ہونے ہی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ لا مذہبی و مادہ پرستی کا مجاہد بھی ہوتا ہے۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتا کہ اسکی جماعت کا ممبر اپنے لامذہب ہونے کا اعتراف کرے، بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ پورے جوش اور سرگرمی کیساتھ غیر اشتراکی لوگوں میں لامذہبی اور فلسفۂ مادیت کی اشاعت کرے اور نوجوانوں کی تعلیم کا پروگرام اس طرح بنائے کہ آئندہ نسل خود بخود مادہ پرستی کا عقیدہ لے کر اٹھے۔ .... اسکے نزدیک کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جو بعد میں آنے والی ہو۔ اسلیے وہ اپنی اسی زمین کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانیکی کوشش کرتا ہے .... کمیونسٹ پارٹی کی تحریک پر ایک خاص سوسائیٹی انجمن منکرین خدا (Union of the God less) کے نام سے قائم کی گئی جس کا مقصدِ وحید اس مسلک کی تبلیغ و اشاعت کرنا ہے .... اس انجمن کو کمیونسٹ پارٹی کی پوری تائید حاصل ہے، بلکہ درحقیقت یہ اسکی متعدد تبلیغی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے"۔ (صفحہ ۹۳ - ۱۹۲)

غیر مادی خدا سے اپنا تعلق قطع کر کے اشتراکیت نے اپنے مندر میں جسمانی خواہشات کا بت بٹھایا ہے اور اس مندر کے پجاری، جو اپنے تعصب میں مذہبی دیوانوں (fanatics) سے کسی طرح کم نہیں ہیں، پورے زور شور سے اس امر کی تلقین کرتے ہیں کہ انسانی اعمال کے اصلی محرکات یہی بھوک اور شہوت کے محرکات ہیں، لہذا صرف انہی کی پرستش کرنی چاہیے۔ اشتراکیت نے انسان کو ایک مشین فرض کر کے جو میکانکی نظریۂ حیات (Mechanistic view of life) اختیار کیا ہے، اسکی تبلیغ و اشاعت کا نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی سوسائیٹی میں اخلاق کی بنیادیں مسمار کر دی گئی ہیں۔ خاندان کے بجائے فرد کو معاشرہ کا جزء ترکیبی (Unit) قرار دیا گیا ہے، اور اہلی زندگی کے نظام کی پراگندگی نے انسانی اخلاق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ اشتراکی

کے نزدیک انسان زمین پر خدا کا خلیفہ نہیں ہے، بلکہ محض حیوانات کی بہت سی انواع میں سے ایک نوع ہے۔ اس میں اور دوسرے حیوانات میں بس اتنا فرق ہے کہ یہ عقل کی زیادہ ترقی یافتہ قوتیں رکھتا ہے، اگر جو ترقی یافتہ قوتیں اسکے پاس ہیں ان کا مصرف اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ حیوانی مقاصد ہی کو زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرنے میں ان سے کام لیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم کمیونزم کے کارنامے کو دیکھتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ مشترک ملکیت، اور وسائل دولت آفرینی کے اجتماعی تصرف سے غریبوں کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ اُس نقصانِ عظیم کے مقابلہ میں ہیچ ہیں جو اشتراکی فلسفہ اور اشتراکی نظم اجتماعی کی بدولت اخلاق اور انسانیت کو پہنچتا ہے، کیونکہ وہ پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا بہم پہنچانے کے معاوضہ میں وہ چیز انسان سے چھین لیتی ہے جس کی بدولت انسان، انسان ہوتا ہے۔

اگر خدا اور یوم آخر کا اعتقاد نہ ہو، اگر طبعی قوانین (Physical laws) سے بالاتر ایک اخلاقی قانون کی حکومت نہ ہو، اگر انسان کا انتہائی مطمح نظر محض حیوانیت ہی کا نشو و ارتقا رہو، تو راست بازی، وفاداری، اخلاص، دیانت، امانت، عصمت و عفت، احترامِ حقوق اور احترامِ انسانیت کے سارے مذہبی و اخلاقی اصول خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، حتی کہ باپ اور بیٹی، ماں اور بیٹے، بھائی اور بہن کے تعلقات کی پاکیزگی کے لیے بھی کوئی بنیاد باقی نہیں رہ سکتی۔ اشتراکی سوسائٹی میں یہ صورتِ حال عملاً پیدا ہو چکی ہے۔ وہاں مرد و عورت کے تعلق کو نکاح کی قید سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ نکاح میں کوئی اہمیت اور کوئی تقدس باقی نہیں۔ آزادانہ شہوانی تعلقات کو نہ صرف جائز بلکہ پسند کیا جاتا ہے، اور اس تخیل کو دماغوں سے نکال دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ایک شخص کسی عورت کو اپنی بیوی قرار دے اور صرف اپنے لیے مخصوص کر کے رکھنا چاہے۔ انسانی ضروریات کے تمام وسائل جس طرح اسٹیٹ کی ملکیت اور سب باشندوں میں

مشترک ہیں، اسی طرح شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ بھی بہرحال انسانی ضروریات سے تعلق رکھتا ہے، اسکو بھی اسٹیٹ کی ملکیت اور تمام باشندوں میں مشترک ہونا چاہیے۔ بیوی، سب کی بیوی ہے، اور شوہر سب کا شوہر ہے۔ کسی کو کسی کے لیے مختص بالذات نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے آزادانہ تعلقات سے جو بچے پیدا ہوں وہ بھی اسٹیٹ کی ملکیت ہیں۔ اور چونکہ اسٹیٹ کو ان بچوں کی پرورش کا بار اٹھانا پڑتا ہے، اسلیے وہ حق رکھتا ہے کہ وقتاً فوقتاً بچوں کی پیدائش کو اپنے وسائلِ پرورش کے لحاظ سے گھٹانے اور روکنے کی تدابیر اختیار کرے، چنانچہ اسی غرض کیلیے اسقاطِ حمل اور منع ولادت کا انتظام سرکاری طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ نقشہ ہے اُس سوسائیٹی کا جو ایک اشتراکی اسٹیٹ کے ماتحت بنائی گئی ہے۔ ایک روسی مصنف (Arlsy bashev) اپنے ایک ناول میں جس کا نام (Samine) ہے یہ خیالات ظاہر کرتا ہے کہ شراب خوری اور زنا کوئی قابلِ شرم چیزیں نہیں ہیں۔ گناہ کوئی چیز نہیں۔ محبت کرنا، خوب پینا اور عورت کا تعاقب کرنا، خاصۂ مردانگی ہے، ایک فطری جذبہ ہے، اور جو چیز فطری ہو وہ گناہ کیسے ہوسکتی ہے[1]۔ یہ اس مصنف کے خیالات ہیں جو کمیونسٹ سوسائیٹی میں اخلاقی ڈسپلن قائم کرنے کا پرزور وکیل ہے۔

اشتراکی اخلاق کوئی حقیقی، متعین اور ثبوتی (Positive) چیز نہیں ہے۔ اشتراکیت نے ان تمام بنیادوں کو ڈھا دیا ہے جن پر ہزارہا سال سے انسانی اخلاق کا ڈھانچہ قائم تھا۔ ان کے بجائے وہ صرف ایک اخلاقی اصول وضع کرتی ہے، یعنی یہ کہ "ہر وہ چیز جو قیام اشتراکیت کی جدوجہد میں مددگار ہو، خیر ہے، اور ہر وہ چیز جو اس میں مزاحم ہو، شر ہے[2]"

لینن اس نکتہ کو بالکل واضح الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

---

[1] Religion Under the Soviet. P. 164

[2] A.B.C. of Communism

"ہم ہر اس اخلاقیت کو رد کرتے ہیں جو فوق الفطری (Supernatural) تخیلات یا ایسے تخیلات سے نکلی ہو جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہوں۔ ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اخلاق تابع ہے طبقاتی جنگ کے مفاد کا۔ ہر وہ چیز اخلاقاً جائز ہے جو قدیم اجتماعی نظام کو مٹانے اور محنت کش عوام کو ایک کرنے کیلیے ضروری ہو .... جس طبقہ کو اب تک لوٹا جاتا رہا ہے، وہ جب اپنے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کریگا تو ایسی جدوجہد میں جھوٹ اور مکروفریب کے ہتھیاروں کا استعمال ناگزیر ہوگا"

اشتراکی تدابیر اشتراکی نظریۂ زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب ہم ان تدابیر کی طرف توجہ کرینگے جو مذہب کے اثرات کو دبانے کیلیے اشتراکی حضرات اختیار کرتے ہیں۔ لینن کہتا ہے:

"مذہب سے جنگ کا قریبی تعلق اس جدوجہد سے ہونا چاہیے جو تمدن و معاشرت کی جڑوں سے مذہب کے نفوذ و اثر کو نکال پھینکنے کے لیے کی جاتی ہے[لہ]"

مسٹر ادھیکاری ہندوستان میں اشتراکیت کے سب سے زیادہ ممتاز داعیوں میں سے ایک ہیں۔ میرٹھ کے مقدمۂ سازش میں جب وہ ملزم کی حیثیت سے عدالت کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے اپنے بیان میں فرمایا:

"مارکس کے پیرو اور مادہ پرست ہونے کی حیثیت سے ہم مذہب کے قطعی مخالف اور خدا کے منکر ہیں۔ مگر ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہب کے خلاف محض ایک نظری اور خیالی پروپیگنڈا کرنے سے مذہب کا استیصال نہیں ہوسکتا۔ لینن اس بات پر زور دیتا ہے کہ مذہب کے خلاف جدوجہد طبقاتی جنگ

لہ The Labour Monthly for December 1926

کی بنیاد پر ہونی چاہیئے[۱]۔ استیصال مذہب کی تبلیغ کے بارے میں ہماری جو روش ہے، اسے واضح طور پر کمیونسٹ انٹرنیشنل (اشتراکیوں کی بین الاقوامی انجمن) کی پانچویں کانگریس نے حسب ذیل الفاظ میں واضح کر دیا ہے :-

"بورژوا طبقہ کے پھیلائے ہوئے تعصبات[۲] و توہمات کے خلاف جدوجہد کے جتنے شعبے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت مذہب کے خلاف جنگ کی ہے۔ مگر یہ جنگ نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے ہونی چاہیے، خصوصاً محنت کش عوام کے ان طبقات میں جنکی روزمرہ کی زندگی میں مذہب بہت گہری جڑوں کے ساتھ جما ہوا ہے"

[۱] ترجمان القرآن - یہ مقام ذرا سی تشریح چاہتا ہے۔ اشتراکیوں کا خیال یہ ہے کہ اگر مذہب کے خلاف محض نفرت انگیز پروپیگنڈا کیا جائے، اور خدا اور اسکے پرستاروں پر لعن و طعن کی جائے تو اس سے کام نہ چلیگا، بلکہ شاید مذہبی خیالات رکھنے والے اپنے عقائد میں اور زیادہ شدید ہو جائینگے۔ لہذا مذہب کے استیصال کی صحیح تدبیر یہ ہے کہ مفلس عوام کو روٹی کیلیے متوسط اور اعلیٰ طبقوں کے خلاف لڑایا جائے اور اس لڑائی میں دو مقصد اپنے پیش نظر رکھے جائیں۔ ایک یہ کہ بھوکے عوام اشتراکیوں کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنی باگیں بالکل انکے ہاتھ میں دیدیں۔ دوسرے یہ کہ متوسط اور اعلیٰ طبقوں کے خلاف عوام کی جدوجہد محض معاشی مسائل ہی کو حل کرنے کیلیے نہ ہو بلکہ اُس اجتماعی نظام کو بالکل توڑ پھوڑ دینے کیلیے ہو جو قدیم مذہبی و اخلاقی تصورات پر تعمیر ہوا ہے۔ یہ دونوں مقصد جب تک پوری طرح حاصل نہ ہوں، اس وقت تک لا مذہبی کی تبلیغ ذرا نرم انداز میں ہونی چاہیے اور جاہل عوام کو وقتاً فوقتاً اطمینان دلاتے رہنا چاہیے کہ ہم تمہارے مذہب کو ہاتھ نہیں لگاتے، ہم تو فقط روٹی کا سوال حل کرنا چاہتے ہیں جس سے مذہب کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوتا۔ پھر جب عوام پوری طرح قابو میں آجائیں اور طبقاتی جنگ اس نوبت پر پہنچ جائے کہ قدیم تمدن و معاشرت کی جڑیں ہل چکی ہوں، تو اس وقت نئی اشتراکی سوسائٹی کی تعمیر شروع کر دیجائے، اور یہ تعمیر ایسے نقشہ پر ہو جس میں مذہب کے لیے کوئی

اشتراکیت کے ثمرات اشتراکیت کے ثمرات کو منفعتِ عامّہ سے کوئی دور کا لگاؤ بھی نہیں - اشتراکی بڑی بلند آہنگی سے شور مچاتے ہیں کہ مذہب دنیا میں خونریزی و بدامنی کا سب سے بڑا سبب ہے، اور دنیا کو امن نصیب ہی نہ ہوگا جب تک کہ مذہب کو مٹا کر اسکی جگہ اشتراکی نظام قائم نہ کر دیا جائے - (ملاحظہ ہو Dialectical Materialism by v. Adorutsky.) مگر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں خونریزی و بدامنی پھیلانے والے جتنے عناصر ہیں ان میں خود اشتراکیت کا نمبر سب سے پہلا ہے، اسلیے کہ اسکی بنیاد نفرت اور حسد پر رکھی گئی ہے، اور اسکے برعکس وہ مذہب جسکی بناء انسانیت کے احترام اور خدا کی محبت پر ہے، امن کے قیام اور حقوق انسانی کی حفاظت کیلیے سب سے بڑی طاقت ہے - یہاں اس بحث

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷ - جگہ نہ ہو-

یہ اشتراکیوں کا اصلی نقشۂ جنگ ہے، اور ہندوستان میں جو حضرات اشتراکی تبلیغ کر رہے ہیں انکی روش سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہوشیاری کیساتھ اس نقشے پر کام کر رہے ہیں - ترجمان القرآن میں ان حضرات کی متعدد تحریریں نقل کر کے اس نقشے کی توضیح کی جا چکی ہے مگر ہمارے بھولے بھالے علما، خدا انکو ہدایت نصیب کرے، ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ یہ "آزادی کے سپاہی" فقط برطانوی شہنشاہی کی جڑیں کھودنا چاہتے ہیں-

اشتراکیوں کو اسوقت سب سے زیادہ ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں مسلمانوں کے عوام تک پہنچنے کا موقع مل جائے، اور یہ عوام ان پر اعتماد کر کے انکی باتیں گوشِ دل سے سننے پر آمادہ ہو جائیں - اس تعارف، بلکہ حسنِ تعارف کیلیے وہ علما کی مدد کے محتاج ہیں، اور قربان جائیے اس مقدس نعرۂ آزادی کے، کہ علما نے بڑی خوبی کیساتھ یہ خدمت انجام دینی شروع کر دی ہے - کچھ مدت اسی طرح اور گذر جائے تو اشتراکیوں کا مقصد پوری طرح حاصل ہو جائیگا - عوام پر قابو پانے کے بعد یہ اپنا اصلی کام شروع کرینگے، اور اسوقت اگر علما نے شور مچایا تو یہی "آزادی کے سپاہی" ان پر "رجعت پسند"، "بورژوا" اور "ٹوڈی" کے آوازے کسینگے اور عوام سے کہینگے کہ لینا ان جبہ پوشوں کو جو پھر تمہیں مذہب کی افیون پلا کر سرمایہ داری کا جوا تمہاری گردنوں پر رکھنا چاہتے ہیں - اس وقت ہر

کو تفصیل کیساتھ پیش کرنے کا موقع نہیں - میں صرف اُن بلند آہنگ اشتراکیوں کی اخلاقی جسارت کی داد ہی دینے پر اکتفا کرونگا جو معصوم حامیان امن کی صورت میں ہمارے سامنے آکر مذہب کی خونریزیوں کا شکوہ کرتے ہیں، درانحالیکہ خود انکی اپنی تاریخ خون اور آگ کے افسانے سے بھری پڑی ہے، اور انہوں نے صرف بیس سال کی مختصر مدت میں اتنا انسانی خون بہایا ہے کہ مذہب غریب صدیوں میں بھی نہیں بہا سکا ہے - جان وین ہرڈ (John Wynne Hird) جس نے اپنی زندگی کے تیس سال روس میں گذارے ہیں، اور جسکی شہادت اس باب میں ایک وقیع شہادت ہے، اشتراکی مظالم کی داستان اعداد و شمار میں بیان کرتا ہے - ان اعداد و شمار کو دیکھیے اور خود فیصلہ کر لیجیے -

۱۹۳۴ء تک جتنے آدمیوں کو روس کی اشتراکی حکومت نے ہلاک کیا انکی طبقہ وار فہرست حسب ذیل ہے[1] :-

بشپ اور پیشوایانِ دین	۳۱
اہلِ خدمات کلیسا	۱۵۶۰

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷ - "آزادی پسند" مولوی یَالَیْتَنِی کُنْتُ تُرَابًا پکارتا نظر آئیگا، اور اسے معلوم ہوگا کہ دنیائے اسلام کے پورے ایک چوتھائی حصہ کو کفر والحاد اور بداخلاقی کی جہنم میں پہنچا کر اس نے اپنی عاقبت کیلیے کتنا اچھا توشہ فراہم کیا ہے -

حاشیہ صفحہ ۲۷ ترجمان القرآن - اشتراکیوں کے نزدیک مذہب دراصل متوسط خوشحال طبقہ (بورژوا) کی پیدا کی ہوئی چیز ہے، اور اس "مبغوض طبقہ" نے اس "مبغوض ترچیز" کو اسلیے پیدا کیا ہے کہ محنت پیشہ عوام کو مذہب کا نشہ پلا کر اپنے قابو میں لائے اور اپنے مقاصد کیلیے ان سے خدمت لے - جن اشتراکیوں کے نام مسلمانوں کے سے ہیں انکے نام و نسب سے دھوکہ نہ کھائیے - اسلام کے متعلق انکا تصور بعینہ یہی ہے، اور اسی بنا پر سیاسیات میں جب مسلم حقوق کا نام آتا ہے تو انکے منہ بگڑ جاتے ہیں اور یہ تیوری چڑھا کر کہتے ہیں کہ مذہب کو کیوں بیچ میں لاتے ہو -

[1] ملاحظہ ہو ڈیلی گزٹ کراچی مورخہ ۵ و ۶ جون ۱۹۳۴ء

جج، وکلا اور مجسٹریٹ	۳۴۵۸۵
اساتذہ اور طالبانِ علم	۱۶۳۶۷
سول عہدہ دار	۷۹۰۰۰
اونچے طبقوں کے لوگ	۶۵۸۹۰
فوجی عہدہ دار	۵۶۳۴۰
مزدور اور محنت پیشہ لوگ	۱۹۶۰۰۰
سپاہی اور ملاح	۲۶۸۰۰۰
کسان	۸۹۰۰۰۰

یہ ۱۹۳۴ء تک کے اعداد ہیں۔ اس کے بعد چار سال میں ان "اشتراکی فرشتوں" نے امن و امان کی جو مزید خدمت کی ہوگی اسکا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔

اشتراکیت کی ناکامی روس میں اشتراکی اصولوں کا تجربہ نہایت وسیع پیمانہ پر اور انتہائی مبالغہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگر ہم سوویٹ حکومت کے کارنامے کو اشتراکیت کے حسن و قبح کا معیار قرار دیں تو بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت کو حقیقت میں ناکامی ہوئی ہے، اور ناکامی بھی نہایت شرمناک۔ حکومت روس کی عظیم الشان فوجی طاقت کو دور سے دیکھ کر اشتراکیت کی کامیابی کا نشان سمجھنا غلطی ہے۔ فوجیت کا ارتقاء نہ تو کسی اجتماعی اصول کی خوبی پر دلالت کرتا ہے، اور نہ فی نفسہٖ یہ کوئی اچھی علامت ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ انسان کے مرتبے کو بلند کرنے میں اشتراکیت کو کہاں تک کامیابی ہوئی؟ کیا اس نے عوام کی حکومت عوام کے فائدے کیلیے قائم کی؟ کیا اس نے پائدار بنیادوں پر ایک عادلانہ نظام اجتماعی مرتب کیا؟ کیا اس نے ایک صالح تمدن تعمیر کیا؟ کیا اس نے جمہور کی مصیبتوں کا علاج کر دیا؟ ڈھٹائی کے ساتھ زبانی دعوے جس قدر

چاہیں کئے جاسکتے ہیں، مگر واقعات اور حقائق سے ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دیا جاسکتا۔

جب ۱۹۱۷ء میں زار کی حکومت ختم ہوگئی تو کسانوں اور مزدوروں کی ایک کانسٹی ٹیوشنل اسمبلی بنائی گئی جسکا صدر لینن تھا۔ ۷ رجنوری ۱۹۱۸ء کو رات کے وقت لینن نے یکایک اس اسمبلی کو توڑ دیا اور اپنی ڈکٹیٹرشپ[1] قائم کردی جس پر وہ مرتے دم تک (۱۹۲۴ء تک) مسلط رہا۔ اس کے بعد اسٹالن اس کا جانشین ہوا اور وہ اب تک روس کا مطلق العنان فرمانروا ہے جسکے اقتدار سے زار کے اقتدار کو کوئی نسبت نہیں۔ پروفیسر ہیکر اس باب میں لکھتا ہے:

"بولشویزم اپنی ڈکٹیٹرشپ کے ساتھ بلاشبہ ایک استبداد ہے، جسکی شدت قدیم استبداد سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے[2]"

ایک مرتبہ کمیونسٹ کانگریس کے کھلے اجلاس میں ایک روسی کسان نے برملا کہا:

"رائے عام محض ایک کھلونا ہے۔ اگر اشتراکی لیڈر چاہیں تو ایک روز

---

[1] ترجمان القرآن۔ ڈکٹیٹرشپ کا قیام لینن یا اسکے جانشین اسٹالن کی ذاتی حرص کا نتیجہ نہیں، جیساکہ بادی النظر میں ایک شخص قیاس کریگا۔ بلکہ دراصل اشتراکی نظام ایک شدید آہنی گرفت کے بغیر نہ قائم ہوسکتا ہے نہ قائم رہ سکتا ہے، اسلیے خود اشتراکی نظام کی فطرت ہی ایک جابر و قاہر ڈکٹیٹر کی طالب ہے۔ وہ ہر وقت ایک ایسی طاقت کا تسلط چاہتی ہے جو ملک کے باشندوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھے، اور قتل و غارت گری کیلیے ہر وقت مستعد رہے، کیونکہ اشتراکیت دراصل انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ انسان جبتک انسان ہے وہ ہمیشہ ایسے غیر فطری نظام کے خلاف آمادۂ بغاوت رہیگا۔ اس بغاوت کو ہولناک طریقوں سے کچلنے کی طاقت اگر موجود رہے تو اشتراکی نظام قائم رہ سکتا ہے۔ جہاں یہ طاقت ہٹی اور اس نظام کا تار و پود بکھرا۔

[2] Religion Under the Soviet. P. 184

کوئی ٹٹو ہمارے نمائندے کی حیثیت سے یہاں بیٹھا نظر آئیگا"

کیسے تعجب کا مقام ہے کہ جو لوگ خدا پرستی کے عقیدے کو صرف اسلیے مٹانا چاہتے ہیں کہ ان کے نزدیک "یہ عقیدہ جبر و استبداد کی اولین اساس ہے" انہوں نے خود خدا کی جگہ لے لی ہے اور ضمیر کی ادنیٰ سی ملامت کے بغیر وہ بدترین قسم کا جبر و استبداد قائم کیے ہوئے ہیں۔

پھر اپنے سب سے بڑے دعوے —— یعنی جمہور کی مصیبتوں کا علاج کرنے میں اشتراکی روس کو کیا کامیابی ہوئی ؟ انکے انقلابی نظریات اور انکی معاشی تجاویز کو سنیے تو کان کے پردوں پر ان کا بڑا وزن محسوس ہوگا مگر حقیقت میں دیکھیے تو روسی کاشتکاروں اور مزدوروں کی حالت کو انکی کوئی اسکیم بھی نہ سدھار سکی۔ مسٹر ڈینس وہیٹلے (Dennis Wheatley.) جو ایک غیر جانبدار مبصر ہے، اپنی کتاب (Red Eagle) میں لینن کی وفات سے ۱۹۳۷ء کے موسم خزاں تک کی کیفیت پر تبصرہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے لینن کے دورِ حکومت کی بے لگام سختیوں کا ذکر کیا ہے، اور اب تک روسی عوام کا ایک بڑا حصہ جن مصائب میں گرفتار ہے انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ ایک روسی مزدور کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے :

"حالات خراب ہیں . . . . بعض مقامات پر تو وہ اتنے خراب ہیں کہ آپ ان پر یقین نہ لائینگے۔ ہمیں اب مصیبتوں کی عادت پڑ گئی ہے، اسلیے کسی نہ کسی طرح زندگی گذار لیتے ہیں، مگر بیرونی ممالک کے کارکن جب یہاں آکر ان حالات کو دیکھتے ہیں تو ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں"

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کے اصول چھوڑ کر جدید اشتراکی تخیلات کو عمل کا جامہ پہنایا گیا ہے، مثلاً "آزاد محبت" (Free Love.) ہر قسم کی حیوانی خواہشات کو پورا

کرنے کا بے قید لائسنس، سستا نکاح اور اس سے بھی زیادہ سستا طلاق (درحقیقت روس میں نکاح کی جو حیثیت اب رہ گئی ہے اس پر لفظِ نکاح کا اطلاق ہی درست نہیں) اور ایسے ہی دوسرے اصول۔ مگر نتیجہ کیا؟ روس عملاً حیوانات کی سرزمین بن گیا ہے، اباحت مطلقہ اپنی تمام ناگزیر خرابیوں کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے، جس نے اشتراکی سوسائیٹی کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ایک ممتاز روسی سائنس دان اینٹون نیمیلوف (Anton - Nemilov.) جو اشتراکیت کا بڑا پرجوش حامی ہے، اپنی کتاب "عورت کا حیاتی حزنیہ" (Biological Tragedy of Woman.) میں اعتراف کرتا ہے کہ مزدوروں میں جنسی انارکی عالمگیر ہوگئی ہے۔ وہ شہوانیت کے اُس طوفانِ عظیم کو جو اشتراکی سوسائیٹی کے اونچے طبقوں سے لیکر نیچے طبقوں تک سب پر چھایا ہوا ہے، سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کہ یہ غیر معمولی صورت حال آخر کار اشتراکی نظام کو تباہ کرکے رہیگی[۱] (ملاحظہ ہو کتاب مذکور صفحہ ۲۰۳ - ۲۰۲) مسٹر دو میلے (Domillet.) جو روس میں بلجیم کے

[۱] ترجمان القرآن۔ مشہور اشتراکی اخبار پروا (Pravda.) میں اب سے چند سال قبل ایک مضمون نکلا تھا جسکے متعلق روسیوں کا کوئی بڑے سے بڑا حامی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سرمایہ داروں کا پروپیگنڈا ہے۔ اس مضمون کے یہ الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں:-

"محبت کے معاملات میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں، اور ان سب اصولوں کی تہ میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ جسقدر زیادہ تم حد کو پہنچنے میں کامیاب ہوگے، یا بالفاظ دیگر جسقدر زیادہ تم حیوانیت سے اقرب ہوگے، اسی قدر زیادہ تم اشتراکی ہوگے۔ یبر فیکلٹی کا ہر ممبر، ہر طالب علم خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس بات کو اصول متعارفہ میں سے شمار کرتا ہے کہ محبت کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو اسکو اپنے اوپر کوئی قید عائد نہ کرنی چاہیے۔ اسی طرح کے اصول متعارفہ میں سے ایک اصل

کونسل رہ چکے ہیں، ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ صنفی انارکی کے باعث اس وقت روس میں تقریباً ۵۰ لاکھ بچے ایسے ہیں جن کا کوئی ولی و وارث نہیں اور جنکی پرورش کا کوئی انتظام نہیں۔ مزید برآں بکثرت کمسن لڑکیاں جن میں بارہ بارہ برس کی بچیاں بھی شریک ہیں، پیٹ بھر روٹی حاصل کرنیکے لیے مجبور ہوتی ہیں کہ اپنے جسم کو بے دردو اشتراکی نوجوانوں کی حیوانی خواہشات پوری کرنے کیلیے ان کے حوالے کردیں۔ حکومت اسکو بھی من جملہ ان پرائیویٹ تجارتوں کے شمار کرتی ہے جنکی اجازت دیکر اپنا مقررہ حصہ وصول کرلینا اس کا حق ہے۔

ایک امریکن مصنف مسٹر بیل (Fred & Beal) نے ایک کتاب لکھی ہے جسکا نام (Word of Nowhere) ہے۔ یہ شخص ایک ممتاز مزدور لیڈر رہے اور انہوں نے اپنی پوری زندگی مزدوروں کی خدمت میں صرف کی ہے۔ امریکہ میں اس کے خلاف سازش

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۔ یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جو لیبر فیکلٹی میں داخل ہے اس پر یہ لازم ہے کہ جب اسکے نوجوان ساتھیوں میں سے کسی کی نظرِ انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلاحیل وحجت اپنے آپ کو اس کے سپرد کردے"

اشتراکی نظام کی ایک ممتاز رکن مادام سمیدووش (Smedovich) نے صنفی انارکی کے متعلق بکثرت واقعات نمونہ کے طور پر پیش کیے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتی ہے کہ ایک روز (Foundling Hospital) میں سولہ سولہ سال کے دو لڑکے ایک بچے کو لیکر آئے اور انہوں نے بیان کیا کہ یہ ہم دونوں کا مشترک بچہ ہے۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ درحقیقت ان دونوں میں سے کون اس بچے کا باپ ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتی ہے کہ نوجوان اشتراکیوں کے نظام میں "افریقی راتیں" (African Nights) منانے کا رواج بکثرت پھیل گیا ہے جنکی وجہ سے یہ ادارے نوجوانوں کا مرکز و مرجع بن گئے ہیں۔ ان افریقی راتوں میں بکثرت لڑکیوں کی زندگیاں خراب کردی جاتی ہیں، اور اسی وجہ سے اب عورتیں ان اداروں میں شریک ہوتے ہوئے گھبرانے لگی ہیں۔ اس تباہ کن صنفی انارکی کا تمام الزام صرف

کا مقدمہ قائم ہوا اور وہ جان بچا کر روس بھاگ گیا۔ وہ ایک سخت متعصب اشتراکی تھا، مگر جب اپنے اشتراکی تخیلات کی جنت کو اس نے اندر سے دیکھا تو وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ اس نے امریکہ واپس جانیکا تہیہ کرلیا، درانحالیکہ امریکہ کی سرزمین میں اسکے لیے حبسِ دوام کی سزا پہلے سے تیار تھی۔ بدقت تمام اسے اس بات پر راضی کیا گیا کہ وہ روس کو پھر ایک موقع دے۔ چنانچہ چند سال تک وہ خارکوف (Kharkov) کے ٹریکٹر پلانٹ میں ایک افسر اشاعت کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ مگر روس کے حالات دیکھ دیکھ کر آخر کار وہ اس قدر مایوس ہوا کہ اسکو امریکہ واپس جانا ہی پڑا۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

"میری ساری عمر مزدور تحریک میں بسر ہوئی، اور میں زندگی بھر اسی کوشش میں لگا رہا کہ خود اپنے اور اپنے ساتھی کارکنوں کے افق کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور درخشاں کروں ...... میں دو دنیاؤں کا نکالا ہوا ہوں، ایک سرمایہ دارانہ انصاف کی دنیا، اور دوسری اشتراکی انصاف کی دنیا۔ جو تاریکی میں نے دیکھی ہے کسی زمین دوز قید خانے کی تاریکی بھی اس سے بڑھ کر گھری اور دم گھونٹنے والی نہیں ہوسکتی، یہ ایک مٹنے والی تہذیب کی تاریکی ہے .... اگر کوئی شخص بولشیوک نظام پر ایمان لانے کے لیے پہلے سے تیار تھا تو وہ شخص میں خود تھا۔ مگر جس سرزمین کی طرف میں نئی آزادی کی تلاش میں بھاگ کر گیا، وہاں میری ساری عقیدت مندیوں کے پرزے اڑ گئے یہ دیکھ کر کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۔ غلط اخلاقی نظریات ہی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ بڑی حد تک اس کی ذمہ داری روسی حکومت کے اس انتظام پر بھی عائد ہوتی ہے کہ اس نے مزدوروں، کارکنوں اور طالب علموں کو ایسے مکانات میں رکھا ہے جہاں لڑکے اور لڑکیاں، مرد اور عورت سب خلط ملط ہو کر رہتے ہیں۔

اس نئے مسلک میں انسانی روح کا فقدان کسی قید خانہ کی دیواروں سے بھی زیادہ بڑھا ہوا ہے"

علمائے اسلام سے ایک گذارش مغرب کے سیاسی اقتدار کی بدولت مادّہ پرستی رفتہ رفتہ اسلامی ممالک میں بھی نفوذ کرتی جارہی ہے اور مذہب کی گرفت غیر محسوس طریقہ پر مگر سرعت کے ساتھ کمزور ہوتی چلی جارہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مادّہ پرستی کو سب سے زیادہ طاقت کمیونزم سے مل رہی ہے۔ یہ نیا مسلک غریبوں اور مفلسوں کی ہمدردی کا بھیس لے کر آتا ہے اور بدترین قسم کی مادّہ پرستی اس پردے میں پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو کمیونزم اور اس کے مادّی فلسفہ کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرسکتا ہے۔ اسلام ظالمانہ سرمایہ داری کا مخالف ہے، مظلوموں اور غریبوں کا حامی ہے، اور خود اپنا ایک معاشی لائحۂ عمل رکھتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسانی روح کے تمام اونچے سے اونچے حوصلوں کے لیے ایک خالص عقلی بنیاد پر تکمیل کے ذرائع بہم پہنچاتا ہے۔ مگر جب تک اسلام کے معاشی لائحۂ عمل کو نافذ نہ کیا جائے، جب تک اسلامی تہذیب کو عمل کی دنیا میں قائم نہ کردیا جائے، جب تک اسلام کا علم رکھنے والے دنیائے جدید کے مسائل پر پوری توجہ نہ صرف کریں، اور عالم انسانی کی امامت کا منصب سنبھالنے کے لیے اٹھ نہ کھڑے ہوں، اسلام ان لامذہبی اثرات کے مقابلے میں بے بس ہی رہیگا۔

نوجوانانِ اسلام سے خطاب اس مضمون میں کمیونزم پر جو مختصر تبصرہ کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت بالکل روشن ہوجاتی ہے کہ اسلام اور کمیونزم دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے جو لوگ کمیونزم کی پیروی پر اصرار کرتے ہیں ان کے لیے ایک ہی راستہ کھلا ہوا ہے، وہ اسلام کو خیرباد کہیں اور اپنے اسلامی نام بدل ڈالیں۔ کمیونزم کے اخلاق میں جائز ہو تو ہو

مگر انسانی اخلاق میں تو یہ نہایت شرمناک فعل ہے کہ وہ اپنے اسلامی ناموں کے پردے میں اسلام کی جڑ کاٹنے کی کوشش کریں۔ خود مسلمانوں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان اشتراکی ملاحدہ کو اپنے گروہ میں نہ رہنے دیں اور انہیں مجبور کردیں کہ وہ اپنے ارتداد کا کھلم کھلا اعلان کرکے اسلامی جماعت سے خارج ہوجائیں۔

۳۸ء کی چند کتابیں

دلی کا سنبھالا :- (از خواجہ محمد شفیع دہلوی) مرحوم دہلی کے ایام عروج کی مرقع نگاری دہلی کی ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جواب نا بود ہے، اندازِ بیان ایسا مؤثر ہے کہ دل بے اختیار ہوجاتا ہے۔ قیمت مجلد عہ/

لطائف غالب :- (مسٹر ایم۔ آشاہ) مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخیٔ بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونیکے لیے اسے ضرور پڑھیے۔ قیمت ۳ر

شعلۂ طور (طبع ثانی) حضرت جگر مراد آبادی کے کلام کا مجموعہ۔ بالکل نئی ترتیب، بہت کچھ تازہ کلام کا اضافہ۔ قیمت کم کردی گئی ہے یعنی سے ر کے بجائے ؏ر

سبدِ چین :- مرزا اسد اللہ خان غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ جس میں انکے وہ فارسی قطعات، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں جو انکی کلیات میں موجود نہیں ہیں مع مکمل سوانح حیات قیمت ۱۲ر

ذکر غالب :- مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستند ترین سوانحعمری جس میں بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں اور جو طلبا کیلیے خاص طور سے بہت مفید ہے۔ قیمت ۸ر

مکتبہ جامعہ دہلی ــــــ نئی دہلی ــــــ لاہور

دورِ جدید کا اہم ترین مسئلہ

مذہب کی ضرورت اور اس کا معیار

جنوری کے آخری ہفتہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کانووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) کے موقع پر لارڈ لوتھین نے جو خطبہ دیا ہے، وہ درحقیقت اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ ـــ جدید اور قدیم دونوں ـــ اس کو گہری نظر سے دیکھیں اور اس سے سبق حاصل کریں۔ اس خطبہ میں ایک ایسا آدمی ہمارے سامنے اپنے دل و دماغ کے پردے کھول رہا ہے جس نے علوم جدیدہ اور انکی پیدا کردہ تہذیب کو محض دور سے نہیں دیکھا ہے، بلکہ خود اس تہذیب کی آغوش میں جنم لیا ہے اور اپنی زندگی کے ۵۶ سال اسی سمندر کی غواصی میں گذارے ہیں۔ وہ پیدائشی اور خاندانی یورپین ہے۔ آکسفورڈ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ "راؤنڈ ٹیبل" جیسے مشہور رسالے کا ایڈیٹر رہ چکا ہے، اور قریب قریب ۲۲ سال سے سلطنت برطانیہ کے مہمات امور میں ذمہ دارانہ حصہ لیتا رہا ہے۔ وہ کوئی بیرونی ناظر نہیں ہے، بلکہ مغربی تہذیب کے اپنے گھر کا آدمی ہے، اور وہ ہم سے بیان کرتا ہے کہ اس کے گھر میں اصل خرابیاں کیا ہیں، کس وجہ سے ہیں، اور اس کے گھر کے لوگ اس وقت درحقیقت کس چیز کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

ایک حیثیت سے یہ خطبہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے سبق آموز ہے کیونکہ اس سے انکو معلوم ہوگا کہ مغربی علوم اور انکی پیدا کردہ تہذیب نری تریاق ہی تریاق نہیں ہے،

بلکہ اس میں بہت کچھ زہر بھی ملا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے اس معجون کو بنایا اور صدیوں استعمال کیا، وہ آج خود آپ کو آگاہ کر رہے ہیں کہ ”خبردار اس معجون کی پوری خوراک نہ لینا، یہ ہمیں تباہی کے کنارے پر پہنچا چکی ہے، اور تمہیں بھی تباہ کر کے رہیگی۔ ہم خود اس وقت تریاق خالص کے محتاج ہیں، اگرچہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں، مگر گمان ضرور ہوتا ہے کہ وہ تریاق تمہارے پاس موجود ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے تریاق کو خاک میں ملا کر ہماری اس زہر آلود معجون کے مزے پر لگ جاؤ۔“

دوسری حیثیت سے اس خطبہ میں ہمارے علماء اور مذہبی طبقوں کے لیے بھی کافی سامان بصیرت ہے۔ اس سے وہ اندازہ کر سکینگے کہ اس وقت جس دنیا میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے سامنے اسلامی تعلیمات کے کن پہلوؤں کو روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ یہ دنیا کئی صدیوں سے مادہ پرستی کی تہذیب کا تجربہ کر رہی ہے، اور اب اس سے تھک چکی ہے۔ صدیوں پہلے روحِ تحقیق اور آزادیٔ فکر کا جو تریاق ہم نے اہلِ فرنگ کو بہم پہنچایا تھا، اس میں خود انہوں نے محض نادانستگی میں لامذہبی اور مادیت کا زہر ملا دیا، اور دونوں کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب کی معجون تیار کی۔ اس معجون کا تریاق اپنے زور سے انہیں ترقی کے آسمان پر اٹھائے گیا، مگر اس کا زہر بھی برابر اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ اب تریاق پر زہر کا اثر پوری طرح غالب ہو چکا ہے۔ اس کے تلخ نتائج کو خوب اچھی طرح بھگت لینے کے بعد اب وہ پھر تریاق کی مزید خوراک کے لیے چاروں طرف نظر دوڑا رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی معجون میں زہریلے اجزاء کون سے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان اجزاء کے ملنے سے انکی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے۔ وہ اب یہ بھی صاف طور پر محسوس کر رہے ہیں کہ ان اثرات کو دور کرنیکے لیے کس قسم کا تریاق انہیں درکار ہے، مگر صرف یہ بات ان کو معلوم نہیں ہے کہ جس تریاق کے وہ طالب

ہیں، وہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کسی کے پاس نہیں، اور یہ آخری خوراک بھی ان کو اسی دواخانے سے ملیگی جہاں سے پہلی خوراک ملی تھی۔ اس مرحلے تک پہنچ جانیکے بعد بھی اگر وہ تریاق کیلیے بھٹکتے رہیں، اور اسے نہ پاکر اپنے زہر سے ساری دنیا کو مسموم کیے چلے جائیں، تو اس گناہِ عظیم میں انکے ساتھ علمائے اسلام بھی برابر کے شریک ہونگے۔ علماء کیلیے اب یہ وقت نہیں ہے کہ وہ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات، اور فقہی جزئیات کی بحثوں میں لگے رہیں۔ رسولؐ اللہ کو علمِ غیب تھا یا نہ تھا؟ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ رسولؐ اللہ کا نظیر ممکن ہے یا نہیں؟ ایصالِ ثواب اور زیارت قبور کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آمین بالجہر و رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ مسجد میں منبر و محراب کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بیسیوں مسائل جن کو طے کرنے میں آج ہمارے پیشوایانِ دین اپنی ساری قوتیں ضائع کر رہے ہیں، دنیا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اور انکے طے ہو جانے سے ہدایت و ضلالت کی اس عظیم الشان لڑائی کا تصفیہ نہیں ہو سکتا جو اس وقت تمام عالم میں چھڑی ہوئی ہے۔ آج اصلی ضرورت اُن مسائل کے سمجھنے کی ہے جو ناخدا شناسی اور لادینی کی بنیاد پر علم اور تمدن کے صدیوں تک نشو و نما پاتے رہنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کی پوری پوری تشخیص کر کے اصول اسلام کے مطابق ان کا قابلِ عمل حل پیش کرنا وقت کا اصلی کام ہے۔ اگر علماء اسلام نے اپنے آپ کو اس کام کا اہل نہ بنایا، اور اسے انجام دینے کی کوشش نہ کی تو یورپ اور امریکہ کا جو حشر ہوگا سو ہوگا، خود دنیائے اسلام بھی تباہ ہو جائیگی، کیونکہ وہی مسائل جو مغربی ممالک کو درپیش ہیں، تمام اسلامی ممالک اور ہندوستان میں پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو چکے ہیں، اور ان کا کوئی صحیح حل بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم سب کے سب اُن لوگوں کے الٹے سیدھے نسخے استعمال کرتے چلے جا رہے ہیں جو خود بیمار ہیں۔ اب یہ معاملہ صرف یورپ اور امریکہ کا نہیں بلکہ ہمارے

اپنے گھر اور ہماری آئندہ نسلوں کا ہے۔

ان وجوہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور علماء، دونوں، لارڈ لوتھین کے اس خطبے کو غور سے ملاحظہ کریں۔ بیچ میں حسب ضرورت ہم مطالب کی تشریح کرتے جائینگے تاکہ مغز کلام تک پہنچنے میں مزید سہولت ہو۔

لارڈ لوتھین اپنی بحث کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

"ایک اور امر تنقیح طلب ہے جسکی طرف آج میں آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ کیا ہندوستان دور جدید کی سائنٹفک اور عقلی تعلیم کے اُس شدید نقصان سے بچ سکتا ہے جس میں یورپ اور امریکہ آج کل مبتلا ہیں؟

"مغرب میں حکمت جدیدہ سے دو بڑے نتیجے رونما ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو اس نے فطرت اور اسکی طاقتوں پر انسان کی دست رس کو بہت زیادہ وسیع کر دیا۔ دوسری طرف اس نے یونیورسٹیوں کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں پر سے عموماً ساری ہی دنیا میں متوارث مذہب کے اقتدار کو کمزور کر دیا۔ دنیائے جدید کی کم از کم آدھی خرابیاں دراصل انہی دو اسباب سے پیدا ہوئی ہیں۔ تہذیب یافتہ آدمی اُن طاقتوں کے نشے سے چُور ہو گیا ہے جو سائنس نے اس کو فراہم کر دی ہیں۔ مگر اس نے علم اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاق میں مساوی ترقی نہیں کی، جو اس بات کی ضامن ہو سکتی تھی کہ یہ طاقتیں انسان کی تباہی کے بجائے اسکی بھلائی کیلیے استعمال ہوں"۔

اس تمہید میں فاضل خطیب نے دراصل انسانی تہذیب و تمدن کے ایک بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سائنس مجرد سائنس ہونے کی حیثیت سے اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ

تحقیق و اجتہاد اور تلاش و تجسس کی ایک لگن ہے جس کی بدولت انسان کو عالم طبیعی کی چھپی ہوئی قوتوں کا حال معلوم ہوتا ہے، اور وہ ان سے کام لینے کے ذرائع فراہم کرتا ہے۔ اس علم کی ترقی سے جو نئی طاقتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، ان کو جب وہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں استعمال کرنے لگتا ہے تو یہ تمدن کی ترقی کہلاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں بجائے خود انسان کی فلاح کی ضامن نہیں ہیں۔ یہ جس طرح فلاح کی موجب ہوسکتی ہیں اسی طرح تباہی کی موجب بھی ہوسکتی ہیں۔ ہاتھ سے کام کرنیکے بجائے اگر انسان مشین سے کام کرنے لگا، جانوروں پر سفر کرنیکے بجائے اگر ریل اور موٹر اور بحری و ہوائی جہازوں پر دوڑنے لگا، ڈاک چوکیوں کے بجائے اگر تار برقی اور لاسلکی سے خبر رسانی ہونے لگی، تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان پہلے سے زیادہ خوشحال ہوگیا۔ ان چیزوں سے جسقدر اسکی خوشحالی بڑھ سکتی ہے اسی قدر اسکی مصیبت اور تباہی بھی بڑھ سکتی ہے، کیونکہ جس دورِ تمدن میں انسان کے پاس صرف تیر و شمشیر کے آلات تھے، اُسکے مقابلہ میں وہ تمدن بدرجہا زیادہ مہلک ہوسکتا ہے جسمیں اسکے پاس مشین گنیں اور زہریلی گیسیں، ہوائی جہاز اور تحت البحر کشتیاں ہوں۔ ترقی علم و تمدن کے موجب فلاح یا موجب ہلاکت ہونیکا تمام تر انحصار اُس تہذیب پر ہے جسکے زیر اثر علوم و فنون اور تمدن و حضارت کا ارتقار ہوتا ہے۔ ارتقار کا راستہ، انسانی مساعی کا مقصد، اور حاصل شدہ طاقتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز یہی تہذیب ہے۔ یہی انسان اور انسان کے باہمی تعلق کی نوعیت طے کرتی ہے۔ یہی اجتماعی زندگی کے اصول اور شخصی، قومی اور بین الاقوامی معاملات کے اخلاقی قوانین بناتی ہے۔ اور فی الجملہ یہی چیز انسان کے ذہن کو اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے تیار کرتی ہے کہ علم کی ترقی سے جو طاقتیں اس کو حاصل ہوں انہیں اپنے تمدن میں کس صورت سے داخل کرے، کس مقصد کیلیے

اور کس طرح انکو استعمال کرے، اور مختلف استعمالات میں سے کن کو ترک اور کن کو اختیار کرے
عالم طبیعی (Physical World) کے مشاہدات اور قوانین طبیعی کے معلومات بجائے
خود کسی اعلیٰ تہذیب کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ کیونکہ انکی رو سے تو انسان کی حیثیت ایک ذی عقل
حیوان سے زیادہ نہیں ہے۔ انکی مدد سے صرف وہی نظریۂ حیات قائم کیا جاسکتا ہے جو
مادیین کا نظریہ ہے، یعنی یہ کہ انسان کیلئے زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس زندگی
میں اپنی حیوانی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرنا اس کا منتہائے مقصود ہے،
اور کائنات میں جو تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کا قانون جاری ہے، اس سے ہم آہنگ ہو جانا
اور گردوپیش کی تمام مخلوقات کو کچل کر خود سب پر غالب ہو جانا ہی طاقت کا اصل مصرف ہے۔
یورپ نے جو تہذیب اختیار کی وہ اسی نظریۂ حیات پر مبنی تھی، اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم اور تمدن
کی ترقی نے انسان کو جس قدر طاقتیں بہم پہنچائیں وہ سب انسانیت کی فلاح کے بجائے اسکی
تباہی کے راستہ میں صرف ہونے لگیں۔ اب خود یورپ والوں کو محسوس ہونے لگا ہے
کہ ان کو حیوانی تہذیب سے بلند تر ایک انسانی تہذیب کی ضرورت ہے، اور اس تہذیب کی
اساس مذہب کے سوا اور کوئی چیز نہیں بن سکتی۔

آگے چل کر لارڈ لوتھین فرماتے ہیں:

"سائنٹفک اسپرٹ (روح تحقیق) نے یہ تو ضرور کیا کہ رفتہ رفتہ پرانے
توہمات کو دور کر دیا، علم کے دائرے کو پھیلا دیا، اور اس طرح مردوں اور
عورتوں کو ان بہت سی قیود سے آزاد کر دیا جن میں وہ پہلے جکڑے ہوئے
تھے۔ مگر اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کیا کہ انسان کو روحانی اور مذہبی
صداقت کا شدت کے ساتھ حاجتمند بنا کر چھوڑ دیا اور اس صداقت تک پہنچنے

کا کوئی راستہ فراہم نہ کیا۔ اکثر اہل مغرب کا حال اب یہ ہے کہ وہ بچوں کی طرح تیز رفتاری، اور رجوبہ زائی، اور حواس کی لذتوں کے شوق میں منہمک ہیں، سادہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ان سے سلب ہو گئی ہے، اور عملاً ان کا کوئی ربط اس لامحدود، ازلی و ابدی حقیقت سے باقی نہیں رہا ہے، جسے مذہب پیش کرتا ہے۔

وہ مذہب جو انسان کا ناگزیر رہنما، اور انسانی زندگی کو اخلاقی مقصد، شرف اور معنویت حاصل ہونے کا واحد ذریعہ ہے، اس کے اقتدار میں زوال آجانے کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مغربی دنیا ان سیاسی مسلکوں کی گرویدہ ہو گئی ہے جو نسلی یا طبقاتی بنیادوں پر قائم ہیں اور سائنس کی اُس صورت پر ایمان لے آئی ہے جو محض مادّی ترقی کو منتہائے مقصود قرار دیتی اور زندگی کو روز بروز پیچیدہ اور گراں بار بنائے چلی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ کیلیے اپنی روح اور اپنی زندگی میں اُس اتحاد کا پیدا کرنا دشوار ہو رہا ہے جو اس کو موجودہ دور کی سب سے بڑی مصیبت، نیشنلزم سے نجات دلائے۔"

اس کے بعد لارڈ لوتھین نے ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا ہے :۔

"کیا ہندوستان کے دو بڑے مذہب، ہندوازم اور اسلام، جدید دور کی تنقیدی اور تحقیقی روح کا مقابلہ، مغرب کی مذہبی عصبیت کی بہ نسبت زیادہ کامیابی کیساتھ کر سکینگے؟ یہ اہم ترین سوال ہے، اور اگر ہندوستان

کو ان مصائب سے بچانا ہے جو مغرب پر نازل ہو چکے ہیں، تو اس ملک کے
علمی اور مذہبی لیڈروں کو اسی سوال پر اپنی توجہ مرکوز کر دینی چاہیے۔ اس
میں تو شک نہیں کہ روح تحقیق رفتہ رفتہ توہم اور جاہلیت کے ان عناصر کو
فنا کر دیگی جو اب تک ہندوستان کے عوام میں پھیلے ہوئے ہیں، اور
یہ بہت اچھا ہوگا، مگر کیا یہ چیز ان دونوں مذاہب کے اصول اخلاق و روحانیت
کو بھی ان لوگوں کے دل و دماغ سے نکال دیگی جو آگے چل کر ہندوستان
کی سیاسی، تمدنی اور صنعتی زندگی کے لیڈر بننے والے ہیں؟ میں ہندوازم
اور اسلام کی اندرونی زندگی سے واقفیت کا مدعی نہیں ہوں، مگر میں سمجھتا
ہوں کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے عناصر رکھتے ہیں جو ان میں سے ہر ایک
کو یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے مردوں اور عورتوں پر قابو رکھنے کے
قابل بنا سکینگے، اگرچہ عیسائیت کی بعض ایسی غلط اعتقادی بندشیں
اس میں ناکام ہو چکی ہیں جنہوں نے اس مذہب کے جلیل القدر بانی کی
پیش کردہ صداقتوں کو چھپا لیا ہے"

جیسا کہ لارڈ لوتھین نے خود اعتراف کیا ہے، حقیقتہً ان کو ہندوازم اور اسلام کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ انہوں نے محض دور سے دیکھ کر چند چیزیں ہندو مذہب میں اور چند اسلام میں ایسی پائی ہیں جو ان کے نزدیک جدید تنقید و تحقیق کی روح کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کو اخلاق و روحانیت کے بلند تر اصولوں پر قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن جو لوگ ان دونوں مذاہب، بلکہ ہندوستان کے تمام مذاہب کا اندرونی علم رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ روح تنقید و

تحقیق کے مقابلہ میں اگر کوئی مذہب ٹھیر سکتا ہے، بلکہ صحیح تر الفاظ میں، اگر کوئی مذہب اس روح کیساتھ اپنے پیرووں کو لیکر آگے بڑھ سکتا ہے، اور ترقی و روشنی کے دور میں پوری نوع انسانی کا مذہب بن سکتا ہے، تو وہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مسیحیت کیوں ناکام ہوئی؟ صرف اس وجہ سے کہ وہ کوئی اجتماعی مسلک نہیں ہے بلکہ اجتماعیت کی عین نفی ہے۔ اس کو صرف فرد کی نجات سے بحث ہے، اور اسکی نجات کا راستہ بھی اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ وہ دنیا سے منہ موڑ کر اپنا رخ آسمانی بادشاہت کی طرف پھیر لے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یورپ کی قوموں نے دنیوی ترقی کے راستہ پر قدم بڑھایا تو مسیحیت انکی مددگار ہونے کے بجائے مزاحم ہوئی، اور انہیں اسکی بندشیں توڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔ اسی سے ملتا جلتا حال ہندوازم کا بھی ہے۔ اس کے پاس بھی کوئی ترقی پرور فلسفہ اور کوئی عقلی قانونِ اخلاق اور کوئی وسعت پذیر نظام اجتماعی نہیں ہے۔ سب سے بڑی طاقت جس نے ہندووں کو ایک سوشل سسٹم میں باندھے رکھا ہے، اور دوسری تہذیبوں کا اثر قبول کرنے سے روکا ہے، وہ ان کا ورن آشرم (Caste System.) ہے۔ مگر موجودہ دور کی روح تنقید و تحقیق کے سامنے اس بندھن کا ٹوٹنا یقینی ہے اور یہ ٹوٹ کر رہیگی۔ اسکے بعد کوئی چیز ہندو سوسائیٹی کو ٹوٹنے سے نہ بچا سکیگی، اور اسکے مقفل دروازے، بیرونی اثرات کے لیے چوپٹ کھل جائینگے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہندووں کے قدیم قوانین معاشرت و تمدن، اور ان کے پرانے بت پرستانہ توہمات، اور ان کے غیر عقلی اور غیر علمی فلسفیانہ قیاسات، دور جدید کی علمی ترقی اور اجتماعی بیداری کے سامنے نہیں ٹھیر سکتے۔ اب ہندو روز بروز ایک ایسے دوراہے کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں جہاں انکی اور بڑی حد تک ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ یا تو وہ اسلام کے خلاف اسی تعصب میں گرفتار رہینگے

جس میں یورپ کی نشأۃ جدیدہ (Renaissance) کے موقع پر مسیحی اہل یورپ گرفتار تھے، اور اُسی طرح اسلام سے منحرف ہو کر مادّہ پرستانہ تہذیب کا راستہ اختیار کرینگے جس طرح اہل یورپ نے اختیار کیا - یا پھر فوج در فوج اسلام میں داخل ہوتے چلے جائینگے -

اس فیصلہ کا انحصار بڑی حد تک مسلمانوں اور خصوصاً ان کے قدیم و جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے طرز عمل پر ہے - اسلام محض اپنے نام سے تو کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا - اسکے اصول اگر محض کتاب میں لکھے رہیں تو ان سے بھی کسی معجزے کا صدور ممکن نہیں - جس انتشار اور بے عملی کی حالت میں مسلمان اسوقت مبتلا ہیں، جو جمود انکے علماء پر طاری ہے، اور جس زنانہ انفعال و تأثر کا اظہار انکی نئی تعلیم یافتہ نسلوں سے ہو رہا ہے، اس سے ہندوستان کی روح کا فتح ہونا تو در کنار، یہ بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ اسلام کے نام لیوا خود اپنی جگہ ہی پر قائم رہ جائینگے - انقلاب کے تیز رو سیلاب میں کسی جماعت کا ساکن کھڑا رہنا غیر ممکن ہے - یا اس کو رو میں بہنا پڑیگا، یا پوری مردانگی کیساتھ اٹھ کر سیلاب کا منہ پھیر دینا ہوگا - یہ دوسری صورت صرف اسی طرح رونما ہو سکتی ہے کہ اول تو عام مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست کی جائے اور ان میں اسلامی زندگی کی روح پھونک دی جائے - دوسرے علمائے اسلام اور نئے تعلیم یافتہ مسلمان مل کر اصول اسلام کے مطابق زندگی کے جدید مسائل کو سمجھیں اور علمی و عملی دونوں صورتوں میں ان کو اس طرح حل کر کے بتائیں کہ اندھے متعصبین کے سوا ہر معقول انسان کو تسلیم کرنا پڑ جائے کہ ایک ترقی پذیر تمدن کیلیے اسلامی تہذیب کے سوا اور کوئی اساس صحیح اور بے عیب نہیں ہو سکتی -

ہندوستان میں مذہب اور سائنس کی نزاع کا وہ تصور اب تک چلا جا رہا ہے

جو یورپ میں اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تھا۔ لیکن یورپ میں نقشہ بدل چکا ہے، اور یورپ کا پس خوردہ کھانے والے ہندوستان میں بھی عنقریب یہ نقشہ بدل جانے والا ہے، لہٰذا وہ وقت قریب آرہا ہے جب "مذہب" کے خلاف کم از کم علمی و عقلی حیثیت سے یہ تعصب باقی نہ رہیگا، بشرطیکہ ہم اُس وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہلے سے تیار رہوں۔

اس حقیقت کی طرف لارڈ لوتھین نے مختصر الفاظ میں یوں اشارہ کیا ہے :۔

"ساٹھ برس پہلے سائنس اور مذہب میں ایسا معرکہ جاری تھا جسکے ختم ہونے کی کوئی توقع نظر نہ آتی تھی۔ زندگی کے روحانی تصور اور مشینی تصور کے درمیان ایسی جنگ برپا تھی جسکے متعلق شبہ ہوتا تھا کہ یہ دونوں میں سے کسی ایک کی موت سے پہلے ختم نہ ہوگی۔ مگر آج دونوں فریقوں نے ڈگیں ڈال دی ہیں۔ نہ سائنس داں، اور نہ دیندار، دونوں میں سے کوئی بھی آج اُس تحکّم کے ساتھ یہ دعوی نہیں کرتا کہ اس نے کائنات کا معمہ حل کرلیا ہے، بلکہ درحقیقت دل میں دونوں کے یہ شبہ پیدا ہوچکا ہے کہ آیا وہ اس معمہ کے متعلق کچھ جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ لہٰذا اب ایک ایسے امتزاج کا امکان پیدا ہوچکا ہے جو تحقیق علمی کے نئے نئے زور شور میں غیر ممکن نظر آتا تھا"۔

لارڈ لوتھین بہرحال مذہب کے مسیحی تصور سے آزاد نہیں ہیں، اور مذہب کا وہ عقلی تصور ان تک پہنچا ہی نہیں ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہی سوچ سکتے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں اب کوئی امتزاج ہوسکتا ہے۔ لیکن ہم مذہب و سائنس کے امتزاج کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو حقیقی

مذہب وہ ہے جو سائنس کی روح، اسکی رہنما طاقت بن جائے۔ اسلام درحقیقت ایسا ہی مذہب ہے، اور آج اس کو سائنس کی روح بننے سے اگر کوئی چیز روکے ہوئے ہے تو وہ اس کا اپنا اندرونی نقص نہیں ہے، بلکہ اس کے علمبرداروں کی غفلت، اور موجودہ سائنس کے علمبرداروں کا جہل اور جاہلانہ تعصب ہے۔ یہ دو اسباب دور ہو جائیں۔ پھر یہ سائنس کے قالب میں جان ہی بن کر رہے گا۔

آگے چل کر فاضل خطیب نے اس امر پر بحث کی ہے کہ موجودہ دور کی علمی بیداری اور عقلی تنقید کے سامنے کس قسم کا مذہب ٹھیر سکتا ہے؟ انسان اس روشنی کے عہد میں جس مذہب کا طلبگار ہے اسکی خصوصیات کیا ہونی چاہییں؟ اور اس وقت انسان کی اصلی حاجات کیا ہیں جن کیلیے وہ مذہب کی رہنمائی ڈھونڈ رہا ہے؟ یہ اس خطبہ کا سب سے زیادہ قابلِ توجہ حصہ ہے۔

"اگر میں صورتِ حال کا غلط اندازہ نہیں کر رہا ہوں، تو یہ حقیقت ہے کہ جو امتحان اسوقت مذہب کو درپیش ہے، اس سے وہ صرف اسی صورت میں کامیابی کیساتھ گذر سکتا ہے، جبکہ نوخیز نسل، اُسکے اندرونی نظام کی جانچ پڑتال کر کے اس امر کا پورا اطمینان حاصل کرے کہ زندگی میں جن عملی مسائل اور جن پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے اس کو سابقہ پڑ رہا ہے ان کا بہترین حل اس مذہب میں موجود ہے۔ شخصی مذہب کا دور اب گذر چکا ہے۔ محض جذباتی مذہب کی بھی اب کسی کو حاجت نہیں۔ اس قسم کے مذہب کا زمانہ بھی اب نہیں رہا جو فرد کو صرف اس حد تک تسلی اور سہارا دے سکتا ہو کہ اسکے اخلاقی طرزِ عمل کیلیے کچھ ہدایات دیدے، اور ایک ایسی نجات کی امید دلا دے جس کا حال مرنے کے بعد ہی کھل سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا سائنٹفک آدمی

تو ہر چیز کو، حتی کہ خود صداقت کو بھی بیّن نتائج کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس کو مذہب کا اتباع کرنا ہے، تو وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہب اسکو یہ بتائے کہ وہ اسکی زندگی کے عملی مسائل کا اپنے پاس کیا حل رکھتا ہے۔ بہت سے جنموں کے بعد آخر کار نروان حاصل ہونے کی امید، یا موت کے دروازے سے گذر جانیکے بعد آسمانی بادشاہت میں پہنچ جانے کی توقع ایسی چیز نہیں ہے کہ صرف اسی کی بنیاد پر وہ مذہب کو قبول کرے۔ اسکی فلسفیانہ جستجو کیلیے مذہب کو سب سے پہلے تو وہ کلید فراہم کرنی چاہیے جس سے وہ کائنات کے معمے کا کوئی قابل اطمینان حل پا سکے۔ پھر اسے ٹھیک ٹھیک سائنٹفک طریقہ پر علّت اور معلول، سبب اور نتیجہ کا بیّن تعلق ثابت کرتے ہوئے یہ دکھانا چاہیے کہ انسان اُن طاقتوں کو کسطرح قابو میں لائے جو اس وقت بے قابو ہو کر نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے تباہ کر دینے کی دھمکیاں دے رہی ہیں، اور کسطرح وہ بے روزگاری، غیر معقول عدم مساوات، ظلم وستم، معاشی لوٹ، جنگ، اور دوسری اجتماعی خرابیوں کا انسداد کرے، افراد کی باہمی کشمکش اور خاندانی نظام کی برہمی کو کسطرح روکے جس نے انسان کی مسرتوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔

انسان آج صرف اس وجہ سے مذہب کی طرف دیکھ رہا ہے کہ سائنس نے اسکی مشکلات کو حل کرنیکے بجائے اور زیادہ بڑھا دیا ہے، اسیلیے وہ مذہب سے اپنے شکوک اور اپنی مشکلات کا حل طلب کرنے میں اُتنا بے چین ہے جتنا اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ اب اگر مذہب اپنے مقام کی حفاظت اور اپنے کھوئے ہوئے میدان کی بازیافت چاہتا ہے، تو اسے اِن سوالات کا روحانی مگر سائنٹفک جواب دینا چاہیے جسکی صحت کو نتائج کے معیار پر اسی دنیا میں جانچا اور پرکھا جا سکے، موت کے بعد دوسری دنیا پر نہ اٹھا

رکھا جائے۔ ہم اہلِ مغرب جانتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا سوال ہے جو ہمارے اس دور میں سامنے آیا ہے۔ کیا آپ ہندوستان میں اس کا جواب دے سکتے ہیں؟"

لارڈ لوتھین کی تقریر کا یہ حصہ پڑھتے وقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پیاسا ہے جسے پانی کا تو علم نہیں، مگر وہ اپنی پیاس کی کیفیات کو ٹھیک ٹھیک محسوس کر رہا ہے اور بتا تا جاتا ہے کہ میرے جگر کی آگ کوئی ایسی چیز مانگتی ہے جس میں یہ اور یہ صفات موجود ہوں۔ اگر پانی اسکے سامنے لاکر رکھ دیا جائے تو اسکی فطرت فوراً پکار اٹھے گی کہ جس چیز کا وہ پیاسا ہے وہ یہی چیز ہے، اور وہ لپک کر اسے منہ سے لگا لیگا۔ یہ حال صرف ایک لارڈ لوتھین ہی کا نہیں ہے، بلکہ یورپ اور امریکہ اور تمام دنیا میں جو لوگ موجودہ تہذیب و تمدن کی گرمی سے خوب تپ چکے ہیں، اور جو فلسفہ و سائنس کے صحراء میں کنارے کی شادابیوں سے گذر کر وسط کی بے آب و گیاہ پہنائیوں تک پہنچ چکے ہیں، ان سب کو آج یہی پیاس محسوس ہو رہی ہے اسب اپنی صفات کی ایک چیز مانگ رہے ہیں جنکا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے، اور ان سب کا یہی حال ہے کہ پانی کا نام نہیں جانتے، یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کہاں پایا جاتا ہے مگر رہ رہ کر پکارتے ہیں کہ

جگر کی آگ بجھے جس سے وہ شئے لا!

پانی کا نام انہوں نے سنا تو ضرور ہے مگر اس نام سے یہ محض اسلیے گھبراتے ہیں کہ اصل شئے کو انہوں نے خود دیکھا نہیں ہے، اور اپنے جاہل و متعصب اسلاف سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ خبردار پانی کے پاس نہ پھٹکنا، یہ ایک بڑی زہریلی چیز کا نام ہے۔ لیکن اب یہ اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر نام کو چھپا کر نفس شئے کو انکے سامنے رکھ دیا جائے تو بے اختیار کہدینگے کہ ہاں! ٹھیک یہی وہ چیز ہے جسکے ہم پیاسے ہیں۔ پھر جب انہیں بتایا جائیگا کہ حضرت! یہ وہی "پانی" ہے جسکے نام سے آپ گھبراتے تھے، تو حیرت سے ان کا منہ کھلا رہجائیگا، اور کہینگے کہ کیسا دھوکا تھا جس میں ہم مبتلا تھے۔

"موجودہ زمانے کا سائنٹفک آدمی" عیسائیت کو خوب چکھ اور پرکھ کر دیکھ چکا ہے، اور یہ بات اس پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ وہ اسکے مرض کی دوا نہیں ہے۔ ہندوازم اور بودھ ازم کے خیالی فلسفوں اور انکی تاریخی قدامت کو دیکھ کر وہ کبھی کبھی ان سے مسحور ہو جاتا ہے، مگر سائنٹفک تنقید و تحلیل کے پہلے ہی امتحان میں انکی ناکامی کھل کر رہتی ہے۔ بودھ مت تو قریب قریب عیسائیت کا ہندوستانی ایڈیشن ہے۔ رہا ہندوازم تو وہ خود اُن مشکلات اور اُن پیچیدگیوں کو پیدا کرتا ہے جن سے نکلنے ہی کیلیے موجودہ زمانے کا سائنٹفک آدمی مذہب کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ انسان اور انسان میں غیر معقول نامساوات سب سے زیادہ اسکے دائرہ میں پائی جاتی ہے۔ معاشی لوٹ کی سب سے بدتر صورت، یعنی مہاجنی سود خواری اسکے سسٹم کا ایک غیر منفک جزو بن چکی ہے۔ جنگ کی اصلی وجہ، یعنی انسان کی نسلی تقسیم اور نسلی منافرت اسکی عین اساس میں پیوست ہے۔ اجتماعی زندگی کیلیے جو نظام اس نے قائم کیا ہے وہ انسانوں کو ملانے والا نہیں بلکہ بے شمار طبقوں اور گوتروں میں تقسیم کرنے والا ہے۔ اسکے قوانین معاشرت اتنے بوسیدہ ہیں کہ موجودہ علمی و عقلی بیداری کے دور میں خود ہزاروں برس کے خاندانی ہندو اُن قوانین کو توڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں، کیونکہ انکی بنیاد علم اور عقل پر نہیں بلکہ تعصبات اور توہمات پر ہے۔ ان دنیوی مسائل سے اوپر، اخلاقیات اور الٰہیات کے دائرے میں وہ اس سے بھی زیادہ ناقص پایا جاتا ہے۔ کائنات کے معمے کو اطمینان بخش طریقے پر حل کرنے کیلیے اسکے پاس کوئی کلید نہیں۔ اس کے عقائد اذعانی عقائد ہیں، سائنٹفک ثبوت ان میں سے کسی چیز کا نہیں دیا جا سکتا۔ اخلاقیات میں وہ دل خوش کن مفروضات کا ایک طلسم ضرور بناتا ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر ایک طلسم مہاتما گاندھی نے بنا رکھا ہے۔ مگر معقولات اور حکمت عملی (Practical Wisdom.) سے اس کا دامن خالی ہے۔ موجودہ علمی بیداری کے دور میں اسکی ناکامی اگر نہیں کھلی ہے تو عنقریب کھل جائیگی۔

اسکے بعد میدان میں صرف اسلام رہ جاتا ہے، اور رہی ان معیاروں میں سے ایک ایک معیار

پر پورا اترتا ہے جو آج کل کا "سائنٹفک آدمی" اپنے مذہب مطلوب کے لیے پیش کر رہا ہے یا کر سکتا ہے
یہ بات کہ مذہب محض ایک شخصی معاملہ ہے، اور محض انفرادی ضمیر ہی سے اسکا تعلق ہے، اب
ایک فرسودہ بات ہو چکی ہے - یہ انیسویں صدی کی بہت سی خام خیالیوں میں سے ایک تھی، جسے
بیسویں صدی کی اس چوتھی دہائی میں بھی ہندوستان کے بعض وہ قدامت پسند اب تک رٹے
جا رہے ہیں جو ادعائے تجدد کے باوجود ہمیشہ دنیا سے پچاس برس پیچھے چلنے کے خوگر ہیں
اب قریب قریب یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ فرد کا تصور جماعت سے الگ نہیں کیا جا سکتا - ہر شخص دوسرے
کیساتھ بے شمار چھوٹے بڑے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، اور سوسائٹی من حیث المجموع ایک
جسم کا حکم رکھتی ہے جس میں افراد کی حیثیت زندہ جسم کے اعضاء کی سی ہے - مذہب کی ضرورت
اگر ہے تو وہ صرف فرد کو اپنے ضمیر کے اطمینان اور اپنی نجات بعد الموت ہی کیلیے نہیں ہے، بلکہ پوری
جماعت کو اپنی تنظیم اور اپنی دنیوی زندگی کے سارے کاروبار چلانے کیلیے ہے، اور اگر اس چیز کی ضرورت
نہیں ہے، تو فرد کو بھی نہیں اور جماعت کو بھی نہیں - یہ تصور سراسر ایک طفلانہ تصور ہے کہ اجتماعی
زندگی کا نظام کچھ اور ہو، اور اس نظام سے بے تعلق ہو کر افراد کے مذہبی عقائد اور انکے مذہبی اعمال
کچھ اور رہیں - مذہبی عقائد اور مذہبی اعمال کا کوئی ربط اگر اجتماعی زندگی سے نہ ہو تو ایسے عقائد اور اعمال
محض بیکار ہیں، اور صرف بیکار ہی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے اجتماعی نظام میں انکا مضمحل ہو جانا یقینی ہے
جسکے دوسرے اجزاء کیساتھ وہ تعامل (Interaction .) قبول نہ کرتے ہوں - لہذا
دو صورتوں میں سے لامحالہ کوئی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے - یا تو پوری جماعت کا نظام سراسر
لامذہبی ہو اور مذہب کو قطعی طور پر انسان کی زندگی سے خارج کر دیا جائے، جیسا کہ اشتراکیوں کا مسلک
ہے - یا پھر اجتماعی نظام پورا کا پورا مذہبی ہو، اور علم اور تمدن دونوں کیلیے مذہب کو رہنما تسلیم کیا جائے
جیسا کہ اسلام کا مقتضا ہے - پہلی صورت کا تجربہ دنیا بہت طویل مدت تک کر چکی ہے - اس سے

وہی کرموے پھل پیدا ہو سکتے تھے، وہی پیدا ہوئے، اور وہی آئندہ بھی پیدا ہونگے جنکا ذکر لارڈ لوتھین نے کیا ہے۔ اب دنیا کی نجات صرف دوسری ہی صورت میں ہے، اور اسکے بروئے کار آنے کے مواقع روز بروز زیادہ پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

مگر جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، ان مواقع سے فائدہ اٹھانا یا انکو ہمیشہ کیلیے کھو دینا، مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ واقعات کی رفتار، دنیا کو ـــ اور دنیا کا ایک جزء ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کو بھی ـــ ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں سے وہ اسلام کیطرف بھی مڑ سکتی ہے، اور مادہ پرستی اور فساد اخلاق کے اسفل السافلین کیطرف بھی۔ طبعاً اس کا رخ ابھی تک دوسرے راستے کیطرف ہے، کیونکہ اسی راستہ پر وہ ایک مدت دراز سے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ اس راستہ کے مہالک دیکھ دیکھ کر وہ سہم رہی ہے، اور چاروں طرف گھبرا گھبرا کر دیکھتی ہے کہ کوئی بچاؤ کی راہ بھی ہے یا نہیں۔ مگر بچاؤ کی راہ خود اسکی اپنی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ وہ درحقیقت اِس وقت ایسے لیڈروں کی محتاج ہے جو قوت کیساتھ اٹھ کر اسکی نگاہوں پر سے پردہ اٹھا دیں اور اسلام کی صراطِ مستقیم کا واحد راہِ نجات ہونا ثابت و مبرھن کر دیں۔

ایسی ایک مجاہد اور مجتہد جماعت اگر مسلمانوں میں پیدا ہو جائے تو مسلمان تمام دنیا کے امام اور پیشوا بن سکتے ہیں، انکو وہی مقامِ عزت پھر حاصل ہو سکتا ہے جس پر وہ کبھی سرفراز تھے اور جس پر مغربی قوموں کو متمکن دیکھ کر آج ان کے منہ میں پانی بھرا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اگر اس قوم کے جمہور اسیطرح دوں ہمتی و پست حوصلگی کیساتھ بیٹھے رہے، اگر اسکے نوجوان یونہی غیروں کا پس خوردہ کھانے کو اپنا منتہائے کمال سمجھتے رہے، اگر اسکے علماء اپنی انہی پرانی فقہ و کلام کی فرسودہ بحثوں میں الجھے رہے، اگر اسکے لیڈروں اور سیاسی پیشواؤں کی ذلیل ذہنیت کا یہی حال رہا کہ لشکر اغیار کے پیچھے لگ چلنے کو مجاہدانہ عزیمت کا بلند ترین مرتبہ سمجھیں اور بیسویں صدی کے سب سے بڑے فریب میں اپنی قوم کو مبتلا کرنا کمال دانشمندی خیال کریں، غرض اگر اس قوم کے دست و پا سے لیکر دل و دماغ تک سب کے سب تعطیل یا خام کاری ہی میں گرفتار رہیں اور اس کروڑوں کے انبوہ سے چند مردانِ خدا بھی جہاد و اجتہاد فی سبیل اللہ کیلیے کمر باندھ کر نہ اٹھ سکیں، تو پھر

تنزیل وتاویل

تفسیر آیۂ:

اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا ... مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ الخ

یوں تو قرآنِ مجید کی آیات میں معنوی تحریف کرنے کی ہر زمانے میں کوششیں کی گئی ہیں، اور ہر دور میں کج نظر لوگوں کا یہی شیوہ رہا ہے کہ کتاب الٰہی کے واضح ارشادات کو توڑ مروڑ کر اپنے نفس کی خواہشات یا اپنے مطلوبوں کے رجحانات و مطالبات کے مطابق ڈھالتے رہیں، لیکن زمانۂ حال میں جو معنوی تحریف آیت مندرجۂ عنوان میں کی گئی ہے، اس سے بڑھ کر گمراہ کن تحریف شائد ہی کبھی کی گئی ہو۔ دوسری تحریفات تو زیادہ تر احکام کی قطع و برید پر مشتمل ہیں، یا تعلیمات اسلامی کے اجزاء میں سے کسی جزو پر ضرب لگاتی ہیں، مگر یہ تحریف سرے سے اُس بنیاد ہی کو اکھیڑ دیتی ہے جس پر قرآن مجید تمام عالم کو ایک صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھکر اسکی زد اُس قاعدۂ کلیہ پر براہِ راست پڑتی ہے جو نوع انسانی کی ہدایت کیلیے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے، اور جسکے تحت ابتداءے آفرینش سے بعثتِ محمدی صلعم تک تنزیل کتب اور ارسال رُسُل کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے اس تحریف نے روح ضلالت

بقیہ مضمون صفحہ ۵۴۔ دنیا جس اسفل السافلین کیطرف جارہی ہے، اسی طبقۂ جہنم میں یہ قوم بھی دنیا کی قوم کیساتھ بندھی بندھی جا گریگی، اور غضب خداوندی ایکمرتبہ پھر پکاریگا کہ اَلَا بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔

کی وہ خدمت انجام دی ہے جس سے ائمۂ کفر و ضلال بھی عاجز رہ گئے تھے - یہ ایک طرف تو غیر مسلموں کو قرآن کی دعوتِ حق قبول نہ کرنے کیلیے خود قرآن ہی سے دلیل بہم پہنچاتی ہے، دوسری طرف مسلمانوں کی جماعت میں جو منافقین، اسلام کی گرفت سے آزاد ہونے کیلیے بے چین ہیں، ان کو کفر و اسلام کا امتیاز اٹھا دینے کی اجازت خود اسلام ہی کی زبان سے دلواتی ہے، اور تیسری طرف جو اچھے خاصے صاحبِ ایمان لوگ خدا کی کتاب اور اسکے رسول کی پیروی پر قائم ہیں، ان کے ایمان کو بھی متزلزل کر دیتی ہے، حتیٰ کہ وہ بیچارے اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ جب قرآن اور رسالتِ محمدی سے انکار کر کے بھی انسان نجات پا سکتا ہے، اور جب نجات کیلیے سرے سے کتاب اور رسالت پر ایمان لانے ہی کی ضرورت نہیں ہے، تو پھر یہ اسلام کی پابندی محض بے معنی ہے، اور ہمارا مسلمان ہونا، یا ہندو، عیسائی، پارسی، یہودی وغیرہ ہونا یکساں ہے - غرض یہ ایک شاہ ضرب (Master Stroke.) ہے جو ہر طرف سے اندر سے بھی اور باہر سے بھی، اسلام کو نشانہ بناتی ہے - داد دینی چاہیے اس ذہانت کی جس نے کتابت ہدایت سے ضلالت کا یہ ہتھیار نکالا -

مجھے بکثرت مجلسوں میں اس تحریف کے کرشمے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ میں نے دیکھا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات بری طرح اسکے شکار ہو رہے ہیں - ناظرین ترجمان القرآن میں سے بھی متعدد اصحاب نے مجھے لکھا کہ اس آیت کی "جدید تفسیر" سے سخت غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں - بعض غیر مسلم مشاہیر کی تحریروں اور تقریروں سے بھی اندازہ ہوا کہ اس "تفسیر نو" سے کافی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے - اس فتنے کو دیکھ کر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا صحیح مفہوم قرآن مجید سے متعین کیا جائے، اور جو معنی اسکو پہنائے گئے ہیں، انکی تردید خود قرآن ہی سے کر دی جائے، کیونکہ جب قائل خود اپنے قول کی تشریح کر دے،

تو کسی شخص کو اپنے طور پر اسکے قول کو کچھ دوسرے معنی پہنانے کا حق ہی نہیں رہتا۔

سب سے پہلے آیت کے اصل الفاظ ملاحظہ کر لیجیے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا	بیشک جو لوگ ایمان لائے (یعنی مسلمان) اور جو
وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، ان میں سے جو کوئی بھی
الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ	اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان لایا اور جس نے بھی نیک
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔	عمل کیے، ان سب کیلیے انکے پروردگار کے ہاں اجر ہے
(البقرہ - ۸)	اور انکے لیے خوف اور رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔

اسی مضمون کا اعادہ سورۂ مائدہ کے دسویں رکوع میں بھی تھوڑے سے تغیرِ لفظی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دونوں آیتوں کا مفہوم متعین کرنے کیلیے ضروری ہے کہ پہلے کلام کا تجزیہ کر کے ایک ایک لفظ کا مفہوم متعین کیا جائے، اور اسکے بعد یہ دیکھا جائے کہ جو بات ان آیتوں میں مختصراً بیان کی گئی ہے، اس کی تفصیل خود قرآن میں دوسرے مقامات پر کس طرح کی گئی ہے۔

(۱) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا - اس کا لفظی ترجمہ تو صرف اس قدر ہے کہ "بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے"۔ مگر اس مبتدا کی خبر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (جو بھی اللہ پر ایمان لایا اور یوم آخر پر) میں دوبارہ ایمان لانیکا جوذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان لانے والے کا ایمان لانا کیا معنی رکھتا ہے؟ الذین اٰمنوا سے اگر وہی لوگ مراد ہوں جو خدا اور آخرت پر ایمان لائے ہیں، تو انکے لیے دوبارہ من اٰمن باللہ والیوم الآخر کہنا فضول ہوگا۔ لہذا یہ ماننا لازم آتا ہے کہ الذین اٰمنوا سے مراد محض گروہ اہل اسلام ہے، اور اسکے مقابلہ میں من اٰمن باللہ والیوم الآخر سے ہر وہ شخص مراد ہے جو حقیقت ایمان کا حامل ہو، بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس گروہ سے انتساب رکھتا ہے۔

نزولِ قرآن کے عہد میں گروہ بندی کے جو تخیلات دماغوں پر مسلط تھے، وہی آج بھی مسلط ہیں

اور ان کو پیشِ نظر رکھ کر یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ قرآن مجید یہاں دراصل فرق کر رہا ہے ان لوگوں کے درمیان جو اہلِ ایمان کے گروہ سے انتساب رکھتے ہیں، اور انکے درمیان جو فی الواقع حقیقت ایمان کے حامل ہیں۔ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا فرقہ بندی کے نقطۂ نظر ہی سے اشخاص میں تمیز کرتی ہے ایک شخص کو مومن یا مسلم کہا جاتا ہے، صرف اسلیے کہ جماعتوں کی تقسیم کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی "مسلم" ہے یا نہیں۔ اسیطرح ایک عیسائی، ایک یہودی، ایک بودھی کو بھی اسکے ظاہری انتساب کا لحاظ کرتے ہوئے عیسائی، یہودی وغیرہ کہا جاتا ہے، قطع نظر اسکے کہ وہ حقیقت میں اپنے گروہ کے ایمانیات پر اعتقاد رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اسی قسم کی صورت حال نزولِ قرآن کے عہد میں بھی تھی کہ حقیقت سے قطع نظر کر کے نوع انسانی کو ظاہر کے اعتبار سے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ لوگ اس لحاظ سے اشخاص اور جماعتوں کے درمیان امتیاز کرتے تھے کہ فلاں شخص محمد صلعم کی جماعت کا آدمی ہے، اور فلاں یہودیوں کے گروہ سے ہے۔ اور فلاں نصرانیوں کے فرقہ والا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ اسی نقطۂ نظر کی غلطی واضح کرنا چاہتا ہے، اسیلیے حقیقت نفس الامری کو بیان کرنے سے پہلے گروہوں کا ذکر اُن کے جدا جدا ناموں سے کر رہا ہے، اور ابتدا اس نے مسلمانوں کے گروہ سے کی ہے۔

(۲) وَالَّذِیْنَ هَادُوْا - لفظی ترجمہ: "وہ لوگ جو یہودی ہوئے"۔ مقصود یہاں بھی وہی ہے جسکی تشریح اوپر کی گئی ہے۔ "یہودی ہونے" سے یہ مراد نہیں کہ جنہوں نے حقیقت میں یہودیوں کا عقیدہ اور مسلک اختیار کیا ہے، اُن کیلیے وہ حکم ہے جو آگے چل کر بیان ہونے والا ہے۔ بلکہ دراصل گروہ اہل یہود میں شمار ہونے والوں کو "الذین هادوا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) وَالنَّصٰرٰی - سلسلۂ کلام کے تحت یہاں نصاریٰ سے مراد بھی "اعتقادی عیسائی"

نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو عیسائیوں کی قوم میں شمار ہوتے ہیں۔

(۴) وَالصَّابِئِیْنَ۔ یہ لفظ اہل عرب کی زبان میں عراق و الجزیرہ وغیرہ علاقوں کے اس گروہ کیلیے بولا جاتا تھا جس میں انبیائے متقدمین کی تعلیمات کیساتھ کواکب پرستی اور ملائک پرستی کے عقائد غلط ملط ہو گئے تھے۔ یہاں بھی صابئین سے مراد محض اس گروہ کے لوگ ہیں، نہ کہ صابیت پر اعتقاد رکھنے والے۔

(۵) مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ، الخ۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "جو کوئی ایمان لایا اللہ پر اور روز آخرت پر اور جس نے بھی نیک عمل کیا، ایسے لوگوں کا اجر انکے پروردگار کے پاس ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ رنج"

یہاں اللہ تعالیٰ نے دراصل اس خیال کی تردید کی ہے جو عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ انسانوں کی تقسیم نام و نسب اور ظاہری انتسابات کے اعتبار سے جو مختلف قوموں اور گروہوں میں کردی گئی ہے، اسی کے مطابق ان کا حشر بھی ہوگا۔ یہودی یہ سمجھتا ہے کہ جو یہودیوں کے گروہ میں شامل ہے وہی نجات پانیوالا ہے، اس گروہ سے باہر کسی کیلیے نجات نہیں ہے۔ نصرانی یہ گمان کرتا ہے کہ نصرانیوں کے گروہ میں شامل ہو جانا گویا اہلِ حق میں شامل ہونا ہے، اور اس گروہ سے باہر سب اہلِ باطل ہیں۔ مسلمان بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ محض گروہ اہل اسلام میں نام اور خاندان اور چند ظاہری اشکال و مراسم کے اعتبار سے شامل ہو جانا ہی "مسلمان" ہونا ہے، اور اس لحاظ سے جو لوگ اس گروہ میں شامل ہیں وہ ان لوگوں پر شرف رکھتے ہیں جو اس لحاظ سے ان میں شامل نہیں ہیں۔ ان غلط خیالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان اور انسان میں حقیقی فرق و امتیاز ظاہری گروہ بندی سے نہیں ہوتا، بلکہ اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔ جو مومن کہلاتا ہے، مگر حقیقت میں ایمان و عمل صالح سے بہرہ ور نہیں، وہ حقیقت میں مومن نہیں ہے، اور اس کا انجام وہ نہیں ہو سکتا

جو مومنین کیلیے مخصوص ہے۔ اسیطرح جو یہودی یا نصرانی یا صابی گروہوں کیطرف منسوب ہے اگر وہ ایمان و عمل صالح کی صفات سے متصف ہو جائے تو وہ حقیقت میں یہودی یا صابی نہیں بلکہ مومن ہے اور اس کا حشر وہ ہوگا جو مومنین صالحین کیلیے مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن اگر وہ ان صفات سے عاری ہو تو جس طرح مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونا کسی شخص کیلیے نافع نہیں، اسی طرح یہودی، یا نصرانی یا صابی گروہوں میں شامل ہونا بھی کسی کیلیے نافع نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر یہود و نصاریٰ کی اس گروہ پرستی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور اسکی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

قَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۔ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۔ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

(البقرہ - ۱۴)

انہوں نے کہا کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائیگا تاوقتیکہ وہ یہودی نہ ہو۔ یا نصرانی نہ ہو۔ یہ محض انکے من سمجھوتے ہیں۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ ہاں جو خدا کے آگے سر تسلیم خم کردے اور نیکوکار رہو اس کے لیے اپنے پروردگار کے ہاں اجر ہے اور ایسے ہی لوگوں کیلیے کوئی خوف اور رنج نہیں ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۔ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۔ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۔

(المائدہ - ۳)

یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اسکے پیارے ہیں۔ اے محمدؐ ان سے پوچھو کہ پھر اللہ تمہارے گناہوں کی تم کو سزا کیوں دیتا ہے؟ دراصل تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے خدا نے اور انسان پیدا کیے ہیں۔

قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا

انہوں نے کہا کہ ہم کو آگ ہرگز نہ چھوئیگی اور اگر چھوئی بھی گئی تو زیادہ سے زیادہ چند روز۔ جو باتیں انہوں

يَفْتَرُوْنَ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ (آلِ عمران - ۳)

نے خود گھڑلی ہیں اُنہی نے انکو اپنے دین کے بارے میں دہوکا دے رکھا ہے۔ پھر اس وقت کیسی کچھ گذریگی جب ہم انکو اُس دن جمع کرینگے جسکے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور ہر شخص کو اپنے کیے کا پورا بدلہ ملیگا اور لوگوں کے ساتھ ظلم نہ ہوگا بلکہ وہی کیا جائیگا جسکے وہ حقیقت میں مستحق ہونگے۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (البقرہ - ۱۱)

اے محمد! ان سے کہو کہ اگر اللہ کے ہاں آخرت کا گھر بس تمہارے ہی لیے ہے اور دوسرے لوگ اس میں حصہ دار نہیں ہیں، تب تو تم کو موت کی تمنا کرنی چاہیے، اگر تم سچے ہو۔

ان تمام آیات میں یہی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اللہ کا کسی گروہ کیساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ نہ نجات پر کسی قوم کا اجارہ ہے۔ تم اس بنا پر کسی خاص برتاؤ کا حق نہیں رکھتے کہ فلاں قوم میں پیدا ہوئے ہو، یا فلاں جماعت سے منسوب ہو۔ خدا کی نگاہ میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ کوئی قوم نہ بجائے خود چہیتی اور مقبول بارگاہ ہے، اور نہ کوئی قوم محض اسلیے راندۂ درگاہ ہے کہ وہ فلاں نام سے موسوم اور فلاں طبقہ سے منسوب ہے۔ خدا کے ہاں اصل وزن انتسابات اور قومیتوں کا نہیں ہے بلکہ اصول اور حقائق کا ہے۔ سچے دل سے ایمان لاؤ گے اور نیک عمل کروگے تو اچھا بدلہ پاؤ گے، اور اگر ایمان و عمل صالح سے خالی رہوگے تو کوئی چیز تمہیں بری جزا سے نہ بچا سکیگی خواہ تم کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔ اسی مضمون کو مسلمانوں اور اہل کتاب دونوں سے خطاب کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے:

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ

عاقبت کا مدار نہ تمہاری خواہشات پر ہے

اَلْكِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا - وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا (النساء - ۱۸)	اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر - جو برا عمل کریگا اسکا بدلہ پائیگا اور خدا کی پکڑ سے بچانے کیلیے اسکو کوئی حامی و مددگار نہ ملیگا - اور جو نیک عمل کریگا اس حال میں کہ وہ باایمان ہو، تو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ایسے ہی لوگ جنت میں جائینگے - دونوں قسم کے

آدمیوں کے ساتھ رتی برابر بھی ظلم نہ کیا جائیگا -

یہی بات ہے جسکو آیت زیر بحث میں ایک دوسرے انداز سے بیان کیا گیا ہے - وہاں اس امر کی بحث نہ تھی کہ مومن ہونے کیلیے کن کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اور صالح ہونے کیلیے عمل کا ضابطہ کیا ہونا چاہیے - یہ تفصیلات قرآن میں دوسری جگہ بیان ہوئی ہیں - وہاں تو محض یہ قاعدۂ کلیہ بیان کرنا مقصود تھا کہ خدا کے ہاں اصلی اعتبار حقائق نفس الامری کا ہے، نہ کہ ان خارجی مظاہر اور سطحی اشکال اور نمایشی انتسابات کا جن پر دنیا کے لوگ کٹے مرتے ہیں - اسی لیے وہاں حقائق نفس الامری کیطرف ایک مختصر اشارہ کر دیا گیا - اب اگر کوئی شخص اس سے یہ معنی نکالتا ہے کہ اس آیت میں خدا اور آخرت پر ایمان لانیکا جو ذکر کیا گیا ہے بس یہی اصل دین ہے، اور یہی انسان کی نجات کیلیے کافی ہے، اس کے بعد کسی رسول یا کسی کتاب کو ماننے اور کسی شریعت کا اتباع کرنیکی ضرورت نہیں، یا یہ کہے کہ قرآن کی دعوت کا منشا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ ہندو پکا ہندو بن جائے، اور یہودی سچا یہودی بنکر رہے، اور ہر شخص اسی مذہب کا پورا اتباع کرے جسکا وہ معتقد ہے، باقی رہا قرآن اور رسالت محمدی پر ایمان، تو وہ نجات کیلیے شرط نہیں، تو ایسے شخص کے متعلق ہم صاف کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی تفسیر نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ مذاق کرتا ہے - اس کی بات تسلیم ہی نہیں کی جا سکتی

جب تک کہ ان دو آیتوں کو مستثنیٰ کر کے سارے قرآن کا انکار نہ کر دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ دین کی اصل ایمان باللہ ہی ہے، اور اسی لیے آیات زیر بحث میں سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا گیا ہے، مگر ایمان باللہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بس خدا کے وجود کا اقرار اور اسکی وحدانیت کا اقرار کر لیا جائے۔ قرآن واضح طور پر خود ہی ہم کو بتاتا ہے کہ ایمان باللہ سے اسکی مراد کیا ہے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ: ۱۲) جس نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا اور نیکوکاری اختیار کی اسکے لیے اپنے رب کے ہاں اجر ہے اور ایسے لوگوں کیلیے کوئی خوف اور رنج نہیں۔

یہاں ایمان باللہ کی تشریح کر دی گئی کہ اس سے مراد "اسلام" یعنی اپنے آپ کو خدا کی رضا کا مطیع بنا دینا ہے، اور اس کا اجر بھی ٹھیک وہی بیان کیا گیا جو آیت ان الذین آمنوا والذین ھادوا میں بیان کیا گیا ہے، یعنی ایسا کرنیوالے کا اجر اسکے رب کے پاس ہے اور اسکے لیے نہ خوف ہے اور نہ رنج۔

پھر دوسرے مقامات پر مزید تشریح کی گئی کہ ایسا ایمان یا "اسلام"، آدمی کو صرف انبیاء اور کتب آسمانی کی وساطت سے مل سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خود اپنی جگہ غور و فکر کر کے خدا اور آخرت کے متعلق ایک عقیدہ اور اخلاق فاضلہ کے متعلق ایک نظریہ قائم کر لے، یا اپنے ذاتی انتخاب سے کام لیکر کچھ باتیں اس مذہب کی اور کچھ اُس مذہب کی چن لے، اور وہ قرآن کی نظر میں "مومن" قرار پائے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ...... وَمَا کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہماری طرف آئی ہے اور ان کتابوں پر جو ابراہیم

أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ ۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۔ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (البقرہ - ۱۶)

اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب کیطرف اتاری گئی تھیں، اور ان کتابوں پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئیں، اور ان سب کتابوں پر جو تمام انبیاء کو اسکے پروردگار کیطرف سے دی گئیں ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کو الگ نہیں کرتے اور ہم اُسی خدا کے فرمانبردار (مسلم) ہیں - پس اگر وہ ایمان لائیں اُسی طرح جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو انہوں نے ہدایت پالی- اور اگر وہ ایسے ایمان سے انکار کریں تو وہ ضد پر ہیں -

آلِ عمران میں دوبارہ اسی مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے اور نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ تک بیان کرنیکے بعد صاف کہا گیا ہے کہ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (رکوع ۹) یعنی جو شخص اس دینِ اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین پسند کرے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائیگا اور آخرت میں وہ نامراد رہے گا۔

پھر اسی سورہ میں دوسری جگہ فرمایا:

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ؟ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا (رکوع ۲)

اگر وہ تم سے حجت کریں تو کہو کہ میں نے اور میرے پیرووں نے تو اپنے آپ کو خدا کی رضا کا مطیع (مسلم) بنا دیا ہے۔ پھر اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) اور جاہلوں (غیر اہلِ کتاب) سے کہو کہ کیا تم بھی اسی طرح اسلام لائے ہو؟ اگر وہ اسلام لائیں، تب وہ بیشک ہدایت یافتہ ہونگے۔

ان آیات سے پوری صراحت کیساتھ یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آیت زیرِ تفسیر میں ایمان باللہ سے مراد محض خدا کو مان لینا نہیں ہے، بلکہ انبیاء علیہم السلام اور کتبِ آسمانی کی تعلیم کے

مطابق ماننا ہے اور اسی کا نام اسلام ہے - قرآن نہایت قطعی الفاظ میں بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ نبی اور کتاب کا واسطہ انسانی ہدایت کیلیے ناگزیر ہے - اس واسطہ سے بے نیاز ہو کر کوئی شخص ہدایت نہیں پا سکتا - اور اس بنا پر کوئی شخص صاحب ایمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ خدا کیساتھ اسکے پیغمبروں پر اور اسکی کتابوں پر بھی ایمان نہ لائے :

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ (النور - ۹)	مومن تو صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائیں -
وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (النساء - ۲۰)	اور جو کوئی اللہ سے اور اسکے ملائکہ اور اسکی کتابوں اور اسکے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کرے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا -
وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُّكْرًا فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا - (الطلاق - ۲)	اور کتنی ہی بستیاں تھیں جنہوں نے اپنے پروردگار اور اسکے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی - تو ہم نے ان سے سخت بازپرس کی اور ان کو بڑی بُری سزا دی اور انہوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھا اور آخر کار وہ گھاٹے میں رہے -

یہ ان بے شمار آیات میں سے چند ہیں جن میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ ایمان باللہ کیساتھ ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل کا تعلق قطعاً غیر منفک ہے، اور رسالت کا منکر کسی طرح خدا کا مومن نہیں ہو سکتا - پھر یہ بھی بیان کر دیا گیا کہ ایمان بالکتب اور ایمان بالرسل کے معنی یہی نہیں ہیں کہ رسولوں کی عظمت و بزرگی کا اعتراف کر لیا جائے اور زبان سے کہدیا جائے کہ ہم ان کو بھی مانتے ہیں اور انکی لائی ہوئی کتابوں کو بھی - ایمان کیلیے محض ایک تعظیمی اعتراف

کافی نہیں ہے جیسا کہ برہمو سماجی حضرات یا گاندھی جی کی قسم کے لوگ کرتے ہیں، بلکہ عملی اطاعت اور اتباع بھی ضروری ہے، اور اس قاعدۂ کلیہ کو تسلیم کرنا ایک ناگزیر شرط ہے کہ نبی کا قول آخری قول (Last Word) ہے اور اسکے مقابلہ میں اپنی حجت چلانے کا کسی مومن کو حق نہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء - ۹)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ فرمانِ خداوندی کے تحت اسکی اطاعت کی جائے

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء - ۱۱)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء - ۱۷)

جس شخص نے رسول سے جھگڑا کیا درانحالیکہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی ہو، اور مومنوں کے طریقے (یعنی اطاعت رسول) کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا، تو جدھر وہ مڑ گیا ہم بھی اسے اُدھر ہی موڑ دینگے اور اسے جہنم میں جھونکینگے اور اس کا بہت برا ٹھکانا ہوگا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب - ۵)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب خدا اور اسکا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو پھر وہ خود اپنے معاملہ میں اپنے اختیار سے کوئی فیصلہ کرے۔ اللہ اور اس کے رسول کی جس نے نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء - ۹)

نہیں تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہونگے جب تک کہ وہ اپنے باہمی اختلاف میں (اے نبی) تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، اور جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں بھی کوئی تنگی محسوس کریں، بلکہ بے چون و چرا اس کو تسلیم کریں۔

اسکے ساتھ یہ بھی تصریح کی گئی کہ کسی ایک نبی یا ایک کتاب کو، یا چند انبیاء، یا چند کتابوں کو مان لینا کافی نہیں ہے، بلکہ تمام انبیاء اور تمام خدائی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایک نبی کا بھی انکار کیا جائیگا تو تمام انبیاء اور خود اللہ تعالیٰ سے کفر لازم آئیگا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (النساء - ۲۱)

جو لوگ اللہ اور اسکے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کریں (یعنی خدا کو مانیں اور رسولوں کو نہ مانیں)۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانینگے اور بعض کو نہ مانینگے اور چاہتے ہیں کہ درمیان کی کوئی راہ اختیار کریں، وہ سب کے سب بالیقین کافر ہیں۔

یہ اسلیے کہ تمام انبیاء ایک ناقابلِ تفریق جماعت ہیں اور ایک ہی دین کی دعوت دیتے ہیں۔ لہذا ایک کا انکار، سب کا انکار، بلکہ اصل دین کا انکار ہے۔ اگر دس آدمی ایک ہی بات کہتے ہوں تو تمہارے لیے اسکے سوا چارہ نہیں کہ یا تو سب کی تصدیق کرو یا سب کی تکذیب کردو۔ جو شخص ان میں سے نو کو سچا کہیگا اور ایک کو جھوٹا کہیگا، وہ دراصل دسوں کی تکذیب بلکہ خود اس بات کی تکذیب کا مرتکب ہوگا جو

خطباتِ جمعہ

خطبۂ اولیٰ - ۲۹ر محرم ۵۷ھ

خطبۂ مسنونہ کے بعد :-

برادرانِ اسلام! پچھلے جمعہ کے خطبہ میں میں نے آپ کو نماز جمعہ کی پابندی اور اہمیت کے متعلق شریعت کے احکام سنائے تھے، اور آپ لوگوں سے درخواست کی تھی کہ خدا اور رسول کے ان احکام کو اپنے ان بھائیوں تک پہنچادیں جو نماز میں شریک نہیں ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگوں نے اپنے اپنے گاؤں کے مسلمان باشندوں کو یہ احکام ضرور پہنچا دیے ہونگے۔ آئندہ بھی میں امید رکھتا ہوں کہ آپ میں سے ہر شخص اس کا خیال رکھیگا، اور آپکے گاؤں کے جو مسلمان

بقیہ مضمون صفحہ ۶۷۔ انہوں نے بالاتفاق بیان کی ہے :-

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ . . . . وَإِنَّ هٰذِهٖ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المومنون)

اے پیغمبرو! ..... اور بلاشبہ تمہاری یہ جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں لہذا مجھ ہی سے ڈرو۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰىٓ أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ - ۲)

اللہ نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ ٹھیرایا ہے جس پر چلنے کا نوح کو حکم دیا۔ اور جسکی وحی اے محمد! تمہاری طرف بھیجی اور جسکا حکم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ اسی دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

(باقی آئندہ)

جمعہ کے پابند نہیں ہیں انکو یہاں نماز کیلیے اپنے ساتھ لانے کی کوشش کریگا۔

آج میں ایک دوسری بات کی طرف آپکو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

ہر مسلمان سچے دل سے یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا کی سب سے بڑی نعمت اسلام ہے۔ ہر مسلمان اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اسکو شامل کیا اور اسلام کی نعمت اسکو عطا کی۔ خود اللہ تعالیٰ بھی اسکو اپنے بندوں پر اپنا سب سے بڑا انعام قرار دیتا ہے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا "اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" "آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا"۔ یہ احسان جو اللہ نے آپ پر فرمایا ہے اسکا حق ادا کرنا آپ پر فرض ہے، کیونکہ جو شخص کسی کے احسان کا حق ادا نہیں کرتا وہ احسان فراموش ہوتا ہے، اور سب سے بدتر احسان فراموشی یہ ہے کہ انسان اپنے خدا کے احسان کا حق بھول جائے۔

اب آپ مجھ سے پوچھیئے کہ خدا کے احسان کا حق کس طرح ادا کیا جائے؟ میں اس کے جواب میں کہونگا کہ جب خدا نے آپ کو امتِ محمدیہ میں شامل کیا ہے تو اسکے اس احسان کا صحیح شکر یہ ہے کہ آپ پورے محمدی بنیں۔ جب خدا نے آپ کو مسلمان قوم میں شامل کیا ہے تو اس کی اس مہربانی کا حق آپ اسی طرح ادا کر سکتے ہیں کہ آپ پورے مسلمان بنیں۔ اسکے سوا خدا کے اس احسانِ عظیم کا حق آپ اور کسی طرح ادا نہیں کر سکتے، اور یہ حق اگر آپ نے ادا نہ کیا تو جتنا بڑا خدا کا احسان ہے، اتنا ہی بڑا اس کی احسان فراموشی کا وبال بھی ہوگا۔ خدا مجھکو اور آپ سب کو اس وبال سے بچائے۔

اس کے بعد آپ مجھ سے سوال کیجیے کہ پورا مسلمان آدمی کس طرح بن سکتا ہے؟

اس کا جواب بہت تفصیل چاہتا ہے اور آئندہ میں جمعہ کے خطبوں میں اسی کا ایک ایک جزو آپکے سامنے پوری تشریح کیساتھ بیان کرتا ہونگا۔ لیکن آج کے خطبہ میں، میں آپ کے سامنے وہ چیز بیان کرتا ہوں جو مسلمان بننے کیلئے سب سے مقدم ہے، اور جس کو اس راستے کا سب سے پہلا قدم سمجھنا چاہیے۔

ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچیے کہ آپ "مسلمان" کا لفظ جو بولتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا انسان ماں کے پیٹ سے "اسلام" ساتھ لیکر آتا ہے؟ کیا ایک شخص صرف اس بنا پر مسلمان ہوتا ہے کہ وہ مسلمان کا بیٹا اور مسلمان کا پوتا ہے؟ کیا مسلمان بھی اسی طرح مسلمان پیدا ہوتا ہے جس طرح ایک برہمن کا بچہ برہمن پیدا ہوتا ہے، ایک راجپوت کا بیٹا راجپوت پیدا ہوتا ہے، اور ایک شودر کا لڑکا شودر پیدا ہوتا ہے؟ کیا مسلمان کسی نسل یا ذات برادری کا نام ہے کہ جسطرح ایک انگریز، انگریزی قوم میں پیدا ہونے کی وجہ سے انگریز ہوتا ہے، اور ایک جاٹ، جاٹ قوم میں پیدا ہونے کی وجہ سے جاٹ ہوتا ہے اسی طرح ایک مسلمان، صرف اس وجہ سے مسلمان ہو کہ وہ مسلمان نامی قوم میں پیدا ہوا ہے؟ یہ سوالات جو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں ان کا آپ کیا جواب دینگے؟ آپ یہی کہینگے نا کہ نہیں صاحب! مسلمان اسکو نہیں کہتے۔ مسلمان تو پیدا نہیں ہوتا بلکہ اسلام لانے سے مسلمان بنتا ہے، اور اسلام کو چھوڑتے ہی آدمی مسلمان نہیں رہتا۔ ایک شخص خواہ برہمن ہو یا راجپوت، انگریز ہو یا جاٹ، پنجابی ہو یا حبشی، جب اس نے اسلام قبول کیا تو مسلمانوں میں شامل ہو جائیگا۔ اور ایک دوسرا شخص جو مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہے، اگر وہ اسلام کی پیروی چھوڑ دے تو وہ مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہو جائیگا، چاہے وہ سید کا بیٹا ہو یا پٹھان کا۔

کیوں حضرات آپ میرے سوالات کا یہی جواب دینگے نا؟ اچھا تو اب خود آپ ہی کے جواب سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ خدا کی سب سے بڑی نعمت، یعنی مسلمان ہونے کی نعمت جو آپ کو حاصل ہے

یہ کوئی پیدائشی چیز نہیں ہے کہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی خود بخود آپ کو حاصل ہو جائے اور خود بخود تمام عمر آپ کے ساتھ لگی رہے، خواہ آپ اسکی پرواہ کریں یا نہ کریں۔ بلکہ یہ ایسی نعمت ہے کہ اس کو حاصل کرنیکے لیے خود آپ کی کوشش شرط ہے۔ اگر آپ کوشش کرکے اسے حاصل کریں تو یہ آپ کو مل سکتی ہے اور اگر آپ اسکی پرواہ نہ کریں تو یہ آپ سے چھن بھی سکتی ہے، معاذ اللہ۔

اب آگے بڑھیے۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے آدمی مسلمان بنتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام لانے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اسلام لانے کا یہ مطلب ہے کہ جو آدمی بس زبان سے کہدے کہ میں مسلمان ہوں، یا مسلمان بن گیا ہوں، وہ مسلمان ہے؟ یا اسلام لانے کا مطلب یہ ہے کہ جسطرح ایک برہمن پجاری بغیر سمجھے بوجھے سنسکرت کے چند منتر پڑھتا ہے اسی طرح ایک شخص عربی کے چند فقرے بغیر سمجھے بوجھے زبان سے ادا کردے اور بس وہ مسلمان ہو گیا؟ آپ بتائیے کہ اس سوال کا آپ کیا جواب دینگے؟ آپ یہی کہینگے نا کہ اسلام لانے کا یہ مطلب نہیں ہے بلکہ اسلام لانے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم دی ہے اسکو آدمی جانے، سمجھے، دل سے قبول کرے، اور اس کے مطابق عمل کرے۔ جو ایسا کرے وہ مسلمان ہے، اور جو ایسا نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہے۔

یہ جواب جو آپ دینگے اس سے خود بخود یہ بات کھل گئی کہ اسلام علم کا نام ہے اور علم کے بعد عمل کا نام ہے۔ ایک شخص علم کے بغیر برہمن ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ برہمن پیدا ہوا ہے اور برہمن ہی رہیگا۔ ایک شخص علم کے بغیر جاٹ ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ جاٹ پیدا ہوا ہے اور جاٹ ہی رہیگا۔ مگر ایک شخص علم کے بغیر مسلمان نہیں ہو سکتا، کیونکہ مسلمان پیدائش سے مسلمان نہیں ہوتا بلکہ علم سے مسلمان ہوتا ہے۔ جب تک اسکو یہ علم نہ ہو کہ حضرت محمدؐ صلی اللہ

علیہ وسلم کی تعلیم کیا ہے، وہ اس پر ایمان کیسے لا سکتا ہے، اور اسکے مطابق عمل کیسے
کر سکتا ہے، اور جب وہ جان کر اور سمجھ کر ایمان ہی نہ لایا تو مسلمان کیسے ہو سکتا ہے۔
پس معلوم ہوا کہ جہالت کیساتھ مسلمان ہونا اور مسلمان رہنا غیر ممکن ہے۔ ہر شخص جو مسلمان
کے گھر پیدا ہوا ہے، جس کا نام مسلمانوں کا سا ہے، جو مسلمانوں کے سے کپڑے پہنتا ہے
اور جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، حقیقت میں وہ مسلمان نہیں ہے بلکہ مسلمان در حقیقت
صرف وہ شخص ہے جو اسلام کا علم رکھتا ہو اور جان بوجھ کر اس پر ایمان لائے۔ ایک کافر
اور ایک مسلمان میں اصلی فرق نام کا نہیں ہے کہ وہ رام پرشاد ہے اور یہ عبداللہ ہے،
اسلیے وہ کافر ہے اور یہ مسلمان۔ اسی طرح ایک کافر اور ایک مسلمان میں اصلی فرق
لباس کا بھی نہیں ہے کہ وہ دھوتی باندھتا ہے اور یہ پیجامہ پہنتا ہے، اسلیے وہ کافر ہے
اور یہ مسلمان۔ بلکہ اصلی فرق ان دونوں کے درمیان علم کا ہے۔ وہ کافر اسلیے ہے کہ
وہ نہیں جانتا کہ خداوند عالم کا اُس سے اور اس کا خداوند عالم سے کیا تعلق ہے، اور اپنے خالق
کی مرضی کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ کیا ہے۔ اگر یہی حال ایک مسلمان
کے بچے کا بھی ہو تو بتاؤ کہ اس میں اور ایک کافر میں کس چیز کی بنا پر تم فرق کرتے ہو، اور کیوں
یہ کہتے ہو کہ وہ تو کافر ہے اور یہ مسلمان ہے؟

حضرات! یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں اس کو ذرا کان لگا کر سنیے اور ٹھنڈے دل
سے اس پر غور کیجیے۔ آپ کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کی سب سے بڑی نعمت جس
پر آپ شکر اور احسانمندی کا اظہار کرتے ہیں، اس کا حاصل ہونا اور حاصل رہنا، دونوں باتیں علم
پر موقوف ہیں۔ اگر علم نہ ہو تو یہ نعمت آدمی کو حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر تھوڑی بہت
حاصل ہو بھی جائے تو جہالت کی بنا پر ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ یہ عظیم الشان نعمت اسکے ہاتھ سے

چلی جائیگی- محض نادانی کی بنا پر وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتا رہیگا کہ میں ابھی تک مسلمان ہوں، حالانکہ درحقیقت وہ مسلمان نہ ہوگا- جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ اسلام اور کفر میں کیا فرق ہے، اور اسلام اور شرک میں کیا امتیاز ہے، اسکی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص اندھیرے میں ایک پگ ڈنڈی پر چل رہا ہو- ہو سکتا ہے کہ سیدھی لکیر پر چلتے چلتے خود بخود اسکے قدم کسی دوسرے راستے کی طرف مڑ جائیں اور اسکو یہ خبر بھی نہ ہو کہ میں سیدھی راہ سے ہٹ گیا ہوں- اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راستے میں کوئی دجّال کھڑا ہوا مل جائے اور اس سے کہے کہ ارے میاں تم اندھیرے میں راستہ بھول گئے- آؤ میں تمہیں منزل تک پہنچادوں- بیچارا اندھیرے کا مسافر چونکہ خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا کہ سیدھا راستہ کونسا ہے، اسلیے نادانی کیساتھ اپنا ہاتھ اس دجّال کے ہاتھ میں دیدیگا - اور وہ اسکو بھٹکا کر کہیں سے کہیں لے جائیگا- یہ خطرات اس شخص کو اسی لیے تو پیش آتے ہیں کہ اسکے پاس خود کوئی لالٹین نہیں ہے اور وہ خود اپنے راستے کے نشانات کو نہیں دیکھ سکتا- اگر اسکے پاس لالٹین موجود ہو تو ظاہر ہے کہ نہ وہ خود راستہ بھولے گا اور نہ کوئی دوسرا اس کو بھٹکا سکے گا- بس اسی پر قیاس کر لیجیے کہ مسلمان کیلیے سب سے بڑا خطرہ اگر کوئی ہے تو یہی کہ وہ خود اسلام کی تعلیم سے ناواقف ہو، خود یہ نہ جانتا ہو کہ قرآن کیا سکھاتا ہے اور حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہدایت دے گئے ہیں- اس جہالت کی وجہ سے وہ خود اپنی نادانی سے بھی بھٹک سکتا ہے اور دوسرے دجّال بھی اسکو بھٹکا سکتے ہیں- لیکن اگر اسکے پاس علم کی روشنی ہو تو وہ زندگی کے ہر قدم پر اسلام کے سیدھے راستے کو دیکھ سکے گا، ہر قدم پر کفر اور شرک اور گمراہی اور فسق و فجور کے جو ٹیڑھے راستے بیچ میں آئینگے انکو پہچان کر ان سے بچ سکیگا، اور جو کوئی راستے میں اسکو بہکانے والا ملیگا تو اسکی دو چار باتیں ہی سن کر وہ خود سمجھ جائیگا کہ یہ بہکانے والا آدمی ہے، اسکی پیروی نہ کرنی چاہیے-

بھائیو! یہ علم جسکی ضرورت میں آپ سے بیان کر رہا ہوں اس پر تمہارے اور تمہاری اولاد کے مسلمان رہنے کا انحصار ہے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ اس سے بے پروائی کی جائے۔ تم اپنی کھیتی باڑی کے کام میں غفلت نہیں کرتے، اپنی زراعت کو پانی دینے اور اپنی فصلوں کی حفاظت کرنے میں غفلت نہیں کرتے، اپنے مویشیوں کو چارہ دینے میں غفلت نہیں کرتے، اپنے پیشے کے کاموں میں غفلت نہیں کرتے۔ یہ کیوں؟ محض اسلیے کہ اگر غفلت کروگے تو جان جیسی عزیز چیز چلی جائیگی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس کام میں غفلت کرتے ہو جس پر تمہارے مسلمان بننے اور مسلمان رہنے کا دار و مدار ہے؟ کیا اس میں یہ خطرہ نہیں کہ ایمان جیسی عزیز چیز ضائع ہو جائیگی؟ کیا ایمان جان سے زیادہ عزیز چیز نہیں ہے؟ تم جان کی حفاظت کرنے والی چیزوں کیلیے جتنا وقت اور جتنی محنت صرف کرتے ہو کیا اس وقت اور محنت کا دسواں حصہ بھی ایمان کی حفاظت کرنے والی چیز کیلیے صرف نہیں کرسکتے؟

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم میں سے ہر شخص مولوی بنے۔ بڑی بڑی کتابیں پڑھے اور اپنی عمر کے دس بارہ سال پڑھنے میں صرف کردے۔ مسلمان بننے کیلیے اتنے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میں سے ہر شخص رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف ایک گھنٹہ لکھنا پڑھنا سیکھنے میں صرف کرے۔ کم از کم اتنا علم ہر مسلمان بچے اور بوڑھے اور جوان کو حاصل ہونا چاہیے کہ قرآن کی تلاوت کرسکے، اردو زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھ سکے، اردو کی جن کتابوں میں اسلامی عقائد اور شرعی احکام اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پاک لکھے ہوئے ہیں انکو دیکھ سکے، اور نماز میں جو کچھ وہ پڑھتا ہے اس کا مطلب جان لے۔ اتنے علم کیلیے کچھ بہت زیادہ وقت کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر ایمان عزیز ہو تو اسکے لیے ایک گھنٹہ نکالنا کچھ مشکل نہیں۔

خطبۂ ثانیہ | الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم۔

برادران اسلام! میں نے جس علم کی ضرورت ابھی بیان کی ہے، مجھے سب سے پہلی فکر یہی ہے کہ اس علاقہ کے دیہات میں اسکی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس کام میں ہماری کوشش اور آپ کی توجہ، دونوں کی ضرورت ہے۔ یہاں دارالاسلام کی مسجد میں ایک مکتب قائم کر دیا گیا ہے اور ایک بہت نیک مولوی صاحب رات دن یہاں رہتے ہیں۔ آپ اپنے بچوں کو یہاں تعلیم کیلیے بھیجیں۔ اسکے علاوہ بڑی عمر کے جو لوگ بے پڑھے لکھے ہیں، ان سے بھی میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ ضرور پڑھنے کیلیے نکالیں۔ ان کے لیے ہم نے وقت کی کوئی قید نہیں رکھی ہے۔ صبح سے شام تک بلکہ رات تک جس شخص کو جس وقت موقع ملے، وہ پڑھنے کیلیے آ جائے۔ کسی شخص سے تعلیم کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جائیگا۔ یہ خدمت بغیر کسی اجرت کے انجام دی جائیگی۔

اسکے ساتھ میں اس کا بھی انتظام کرنے والا ہوں کہ چند تعلیم یافتہ آدمی خود دیہات میں جا کر تھوڑا وقت اپنے دیہاتی بھائیوں کو تعلیم دینے میں صرف کریں۔ اس علاقے میں جو لوگ پڑھے لکھے ہیں اگر وہ اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانیکے لیے تیار ہوں اور اپنا تھوڑا تھوڑا وقت اس کار خیر میں صرف کریں تو اس سے ہمیں تعلیم پھیلانے میں بہت مدد ملیگی، اور ہمارا شکریہ تو خیر کیا قیمت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کیطرف سے ان کا شکریہ ایسا ادا ہوگا جس کا سلسلہ کبھی منقطع ہونے والا نہیں ہے۔

برادران ملت۔ آج کے خطبہ میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے یہ آپ ہی کی دین و دنیا کی بھلائی کیلیے ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ لوگ میری ان باتوں کی طرف توجہ کرینگے۔

(درود وسلام ودعا)

مطبوعات

تفسیر سورۂ فیل | تالیف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ - ترجمہ مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ضخامت ۱۳ اصفحات - قیمت ۸ ر (دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح - سرائے میر ضلع اعظم گڈھ)

اصل کتاب عربی زبان میں پہلے چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور اس پر ترجمان القرآن میں ریویو کیا جا چکا ہے - مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اسے اردو قالب میں ڈھالکر باقساط رسالۂ الاصلاح میں شائع فرمایا تھا تاکہ عربی سے ناآشنا طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے - اب اسی ترجمہ کو ایک رسالہ کی شکل میں مرتب کر دیا گیا ہے - ترجمہ نہایت کامیاب اور سلجھا ہوا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مترجم موصوف مولانا فراہیؒ کی تصنیفات کے ترجمہ کا حق خوب ادا کرتے ہیں -

۱- تفسیر سورۂ کافرون اور ۲- سورۂ والعصر | تالیفات مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ - ترجمہ مولوی امین احسن صاحب اصلاحی حجم ۴۸، ۶۶ صفحات، قیمت ۴ ر، ۶ ر (پتہ وہی جو اوپر مذکور ہوا)

مولانا فراہیؒ کی قرآنی بصیرت، انکا تبحر اور ذوق اجتہاد اہلِ علم کیلیے کسی تعارف کا محتاج نہیں تفسیر نظام القرآن جو آپ کی قرآن فہمی کا اعلیٰ ترین شاہکار ہے، اُسکے بیشتر اجزا چھپ کر اہلِ نظر کے سامنے آچکے ہیں - یہ دونوں کتابیں اسی سلسلۂ تفسیر کی دو کڑیاں ہیں - پہلی تفسیر میں مصنفؒ نے اپنے خاص اصول تاویل اور محققانہ طرز تفسیر کے مطابق بتلایا ہے کہ یہ سورۃ رواداری کی نہیں بلکہ دراصل برأت اور ہجرت کی سورۃ ہے اور کفار سے پوری طرح کٹ کر ان سے اعلان جنگ ہے - یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی ہے جب قریش کا انکار و تمرد، حق کی مظلومی اور کفار کے اصلاح پذیر ہونے سے مایوسی اپنی انتہا

کو پہنچ جاتی ہیں۔ اسوقت سنۃ اللہ مقتضی ہوتی ہے کہ پیغمبر ہجرت کر جائے اور ان باطل پرستوں پر عذاب کے دروازے کھول دیے جائیں۔ مصنف نے قرآنی تصریحات سے ثابت کیا ہے کہ بعثت کے تین مراحل ہوتے ہیں۔ (۱) برأت (۲) ہجرت (۳) توبہ۔ پھر فلسفۂ ہجرت پر سیر حاصل بحث کی ہے کہ پیغمبر کو ہجرت کا حکم کب ملتا ہے، اس سے پہلے قوم عذاب الٰہی سے کیوں محفوظ رہتی ہے، اور اس کے بعد ہی کس طرح نصرت الٰہیہ نمودار ہوتی ہے، حق سربلند ہوتا اور شوکتِ کفر پاش پاش ہو جاتی ہے؟

دوسری تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ والعصر کی چھوٹی سی سورہ کتنے کثیر معانی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اور وہ کس طرح جوامع الکلم کی حیثیت رکھتی ہے، جسکے چند لفظوں میں انسانی خسران اور فلاح کا پورا نظام نامہ بیان کر دیا گیا ہے۔ سورہ کے انداز بیان اور اسکے الفاظ بالخصوص لفظ العصر اور صالحات سے جو حقیقت افروز نتائج مستنبط کیے گئے ہیں، وہ قرآنی اعجاز بلاغت کی روشن ترین دلیل ہیں۔

ایمان اور عمل صالح کی اصل ماہیت سے متعلق نہایت لطیف اور اہم نکات اس کتاب میں موجود ہیں۔ ایمان کے بسیط یا مرکب ہونے پر جو دور از کار لفظی نزاعیں پیدا ہوگئی ہیں، اُن کے متعلق ایک تسلی بخش تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے بتایا ہے کہ قرآن کے نزدیک سچا اور معتبر ایمان تو وہی ہے جو اخلاصِ نیت، اذعانِ قلب اور عقائد و اعمال کے سارے محاسن پر محیط ہو، اور اسی لحاظ سے اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں عطف، تغایر کا نہیں، بلکہ تفصیل کا ہے۔ لیکن ایمان کا ایک اور بھی مفہوم ہے، یعنی اس کا سیاسی مفہوم، جس پر احکام قضا کا نفاذ ہوتا ہے۔ یہ اُس ایمان سے بالکل مختلف چیز ہے جس پر نجاتِ اخروی کا دار و مدار ہے۔

امام اعظمؒ کا خیال کہ ایمان ایک بسیط شے ہے اسی سیاسی یا احکامی نقطۂ نظر سے ہے۔ انکے سامنے اصل سوال یہ تھا کہ ایمان قول و عمل دونوں کا نام ہے یا محض قول کا؟ یہ نہ تھا کہ ایمان علم و عمل دونوں کا نام ہے یا محض علم کا؟ کیونکہ اس کا جواب محض ایک ہی ہے اور اس سے کسی کو اختلاف کا یارا نہیں ہو سکتا۔

تواصی بالحق و تواصی بالصبر سے وجوب خلافت پر نہایت مدلل بحث کی گئی ہے۔

اپنی عادت کے مطابق یہ دونوں تفسیریں بھی مولانا رحمتہ اللہ علیہ نے عربی ہی میں لکھی تھیں لیکن ان کے شاگرد خاص مولوی امین احسن صاحب اصلاحی نے ان قیمتی جواہر پاروں کو اردو میں منتقل کر کے تمام ارباب ذوق کیلیے عام کر دیا ہے۔ نفس ترجمہ کے متعلق مترجم کا نام بتا دینے کے بعد شاید کسی اظہار رائے کی حاجت نہ ہو گی۔

جنت کی کنجی | مرتبہ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیتہ علمائے ہند۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت عہ ملنے کا پتہ :- منیجر دینی بک ڈپو۔ بیت السعید۔ کوچہ ناہر خان - دہلی۔

اخبار الجمعیتہ میں مصنف موصوف نے ایک سلسلہ مضامین نکالا تھا جس میں ترغیب اعمال کیلیے ان تمام احادیث کو اردو میں جمع کر دیا تھا جن میں امت مرحومہ کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ پھر یہ پورا سلسلہ یکجا کتابی صورت میں شائع کیا گیا جو اپنی مقبولیت کے باعث چند دنوں میں ختم ہو گیا۔ اب کتاب مذکور کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی اور بعض مضامین کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں ۸۰ عنوانات کے تحت (۲۶۲) احادیث، اور آخر میں "عرش الٰہی کا سایہ کن لوگوں پر ہو گا" کے عنوان سے ۳۰ حدیثیں الگ جمع کی گئی ہیں۔ جمع احادیث میں جیسا کہ مولانا موصوف کو خود اعتراف ہے عالمانہ اور محققانہ حیثیت کو چھوڑ کر واعظانہ حیثیت اختیار کی گئی ہے یعنی ترغیب خیر کے خیال سے صحیح اور مستند احادیث

کے ساتھ ضعیف اور منکر روایتوں کا بھی ایک معتد بہ حصہ شامل کر دیا گیا ہے، اور یہ واعظین کی ایک معروف سنت ہے جس سے ہمیں سخت اختلاف ہے۔ کیا صحیح حدیثوں اور قرآنی آیتوں سے ترغیب اعمال کیلیے کافی مواد نہیں مہیا کیا جا سکتا کہ خواہ مخواہ موضوع اور کمزور روایتوں کو بیان کیا جائے، درانحالیکہ وہ روایتاً اور درایتاً دونوں حیثیت سے بدیہی البطلان معلوم ہوتی ہوں اور ان سے بجز اسکے اور کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ حدیث سے انکار و تنفر کی بڑھتی ہوئی لے اور زیادہ بڑھ جائے۔

احادیث کا ترجمہ حسن ادا اور فصاحت بیان سے پوری طرح آراستہ ہے، وہ شایقین علم دین جو عربی نہیں جانتے اس مجموعہ سے بہت کچھ تسکین خاطر حاصل کر سکتے ہیں

مختصر تاریخ ہند تالیف مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:- منیجر دار المصنفین، شبلی منزل۔ اعظم گڑھ۔

تاریخی تحقیقات کے سلسلہ میں دار المصنفین نے جو قابل رشک خدمات انجام دی ہیں اردو لٹریچر ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ کتاب زیر تبصرہ اسی ادارہ نے شائع کی ہے۔ یہ ہندوستان کی مختصر تاریخ ہے جو مدرسوں اور مکتبوں کے طلبہ کیلیے لکھی گئی ہے۔ صرف دو سو صفحات کے اندر ہندوستان کی ابتدائی تاریخ یعنی "پتھر کے زمانہ" سے لیکر غدر ۱۸۵۷ء تک کے مجمل حالات پوری طرح سمیٹ لیے گئے ہیں۔ مختصر ہونیکے باوجود اس کے اندر بے شمار ایسے بیانات موجود ہیں جنکے تذکرہ سے ہمارے مدارس میں پڑھائی جانیوالی تاریخیں اکثر خاموش ہیں مثلاً طلبہ کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی تاریخ محمود غزنوی کے حملوں سے شروع ہوتی ہے حالانکہ پہلی صدی ہجری ہی سے مجاہدین عرب کا سیلاب ساحل ہند سے ٹکرانا شروع ہو گیا تھا اور آخر کار محمد بن قاسم نے محمود غزنوی سے بہت پہلے سندھ اور اسکے نواح

کو لیکر ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم کی۔ اسی طرح عام تاریخوں میں اسلامی حکومت کے سلسلے میں صرف تخت دہلی اور دکن کی ریاستوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے حالانکہ مالابار، گجرات اور بنگال وغیرہ ممالک میں مغلوں کی بادشاہت سے پہلے بہت سی اسلامی ریاستیں حکمرانی کر چکی ہیں۔

اختصار کے باوجود مولف نے فلسفہ تاریخ کے اصول کی بھی ایک حد تک رعایت کی ہے۔ پرانی سلطنتوں کے تمدنی، تعلیمی اور ملکی انتظامات پر بھی ضمناً روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر خاندان کے حالات لکھنے کے بعد اس کے مخصوص تعمیری کارناموں پر اجمالی تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ جمع و ترتیب واقعات میں کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ قدیم سکوں اور کتبوں سے کافی فائدہ اٹھایا گیا ہے، زبان نہایت صاف، شستہ اور سلیس ہے، طلبہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر مولف نے مہاتما گوتم بدھ اور مہابیر وغیرہ پیشوایانِ مذہب کا تذکرہ واحد غائب کے صیغوں کی بجائے جمع غائب کے صیغوں سے کیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ ضرورت ہے کہ چھوٹے بڑے تمام طلبہ کیلیے تاریخیں از سرِ نو مدون کی جائیں جن میں موجودہ درسی تاریخوں کی طرح واقعات کو مسخ کر کے ان کے محض تاریک پہلو نہ دکھائے گئے ہوں اور نہ اس متعصبانہ طرزِ نگارش سے بیان و تحقیق کا دامن آلودہ ہونے پائے جسکی ناپاک بنا انیسویں صدی کے شروع میں انگریزی پالیسی نے رکھی تھی اور جس نے ملک کے تمام فرقوں میں تعصب اور بے اعتمادی کی وبا پھیلا رکھی ہے۔

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں	۵ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	۵۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	۱۰۰ نسخے	"

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے ہے۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۲۵ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

شعبۂ اشاعت دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵ؔ۔ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کیلیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍ محصولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سہیل و تصاویر پرن پریس لاہور میں طبع ہوئے